ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ
نومبر ۲۰۱۸ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ نبی اکرم ﷺ بحیثیت رحمۃٌ للعالمین
امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

❁ ختمِ نبوت کے تکمیلی مظاہر اور ہماری ذمہ داریاں
شجاع الدین شیخ

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی وعملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ
516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501
maktaba@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؗ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	67
شمارہ :	11
ربیع الاوّل	1440ھ
نومبر	2018ء
فی شمارہ	-/30

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ―― 5
''باہمی انتشار'' عالمِ اسلام کا اصل مسئلہ
ادارہ

بیانُ القُرآن ―― 9
سورۃ الصّٰٓفّٰت (آیات ۱ تا ۷۴)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نقوشِ سیرت ―― 25
نبی اکرم ﷺ بحیثیت رحمۃ للعالمین
حافظ عاکف سعید

ایمانیاتِ اسلام ―― 45
ختمِ نبوت کے تکمیلی مظاہر اور ہماری ذمہ داریاں
شجاع الدین شیخ

الدِّینُ النَّصِیحۃ ―― 61
اولی الامر کو نصیحت کرنے کے آداب
سید عبدالوہاب شیرازی

فکر و فلسفہ ―― 82
فلسفۂ خیر و شر اور حیاتِ انسانی
راحیل گوہر

اقبالیات ―― 93
اقبال کے نظریۂ خودی کی قرآنی تعبیر
پروفیسر عبداللہ شاہین

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

''باہمی انتشار'' عالمِ اسلام کا اصل مسئلہ

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے گزشتہ چند ہفتوں میں دوسری مرتبہ سعودی عرب کے خلاف دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا ہے۔ پہلے انہوں نے سعودی حکمران شاہ سلمان کو تنبیہ کی کہ وہ امریکی فوج کی حمایت کے بغیر دو ہفتے بھی اقتدار میں نہیں رہ سکتے۔ جس کے جواب میں سعودی ولی عہد محمد بن سلمان نے کہا کہ جب امریکہ نہیں تھا تو ہمارا ملک اس وقت بھی قائم تھا۔ خاص طور پر انہوں نے اوبامہ دور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ نے سعودی عرب کے ساتھ منفی رویہ اختیار کیے رکھا تو اس وقت بھی سعودی عرب نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سادہ لفظوں میں یہ امریکہ کو پیغام تھا کہ سعودی عرب امریکہ کی دوستی کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ اس حوالے سے مزید صورتحال نکھر کر اس وقت سامنے آگئی جب سعودی نژاد امریکی شہری جمال خاشقجی کے استنبول میں سعودی سفارتخانہ میں قتل کا معاملہ سامنے آیا۔ جمال خاشقجی کا تعلق سعودی عرب سے تھا لیکن سعودی حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت میں اُسے ملک بدر ہونا پڑا۔ اس نے امریکی شہریت حاصل کی اور ایک امریکی روزنامہ واشنگٹن پوسٹ میں کالم لکھنے شروع کیے۔ وہ اپنے کالموں میں سعودی حکمرانوں پر سخت تنقید کرتا تھا جس کی وجہ سے سعودی حکومت اس سے نالاں تھی۔

۲/اکتوبر کو وہ استنبول میں طلاق کے کاغذات حاصل کرنے سعودی سفارتخانے میں گیا لیکن باہر نہ آسکا۔ سب سے پہلے ترک حکام نے الزام عائد کیا کہ خاشقجی کو سعودی سفارتخانے میں قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد امریکہ اور یورپی ممالک بھی میدان میں آگئے اور اقوام متحدہ نے بھی اس کا سخت نوٹس لیا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے سعودی حکام کو ایک بار پھر دھمکی دی کہ اگر خاشقجی کے قتل میں سعودی حکومت ملوث ہوئی تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔ اس کے جواب میں سعودی عرب نے بھی اپنے میڈیا کے ذریعے جوابی کارروائی کی دھمکی دی جس میں کہا گیا کہ سعودی عرب ممکنہ طور پر تیل کی ترسیل روک سکتا ہے جس سے قیمتوں میں دگنا سے بھی زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ سٹریٹیجک اعتبار سے اہم علاقے تبوک میں روس کو

اڈہ دینے پر تیار ہوسکتا ہے' ایران سے بات چیت شروع کرسکتا ہے اور سب سے بڑھ کر امریکہ سے اسلحے کی خریداری روک سکتا ہے۔

سعودی عرب کے سرکاری ذرائع کی جانب سے جوابی دھمکیوں کے بعد ڈونلڈ ٹرمپ نے سعودی عرب کے شاہ سلمان کے ساتھ فون پر بات کی اور اس کے بعد خود یہ موقف اختیار کیا کہ جمال خاشقجی کی گمشدگی کے پیچھے سرکش قاتل ہوسکتے ہیں۔ گویا سعودی عرب کی جوابی دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور امریکی صدر نہ صرف اپنے سخت رویے میں نرمی لانے پر مجبور ہوئے بلکہ سعودی عرب کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کے لیے اپنے وزیر خارجہ کو بھی فوراً سعودی عرب روانہ کرنا پڑا۔ کیونکہ امریکہ جانتا ہے کہ مڈل ایسٹ سے اس کے نکل جانے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔

صحافی جمال خاشقجی کی گمشدگی اور مبینہ قتل کی مذمت لازماً کی جانی چاہیے' لیکن اس ساری صورتحال سے جو بات کھل کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ مسلم حکمران اگر خود عالمی طاقتوں کی ڈکٹیشن قبول نہ کریں تو کوئی بیرونی طاقت انہیں ڈکٹیٹ نہیں کرسکتی۔ بالفاظ دیگر اگر مسلم حکمران خود اپنے عالمی آقاؤں کے آگے جھکنا چھوڑ دیں تو عالم اسلام پر عالمی طاقتوں کی اجارہ داری کا طلسم ٹوٹ سکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ناممکن لگتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایسا مشکل بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک چیز اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہے خودداری۔ بھارت اور چین اکثر مسلمان ممالک کے بعد آزاد ہوئے تھے مگر وہ آج لیڈنگ پوزیشن میں ہیں' جبکہ مسلم ممالک آزاد ہونے کے باوجود ابھی تک عالمی طاقتوں کے چنگل سے نہیں نکل سکے' حالانکہ وسائل کے لحاظ سے چین اور بھارت مسلم ممالک کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ مسلم ممالک ان بے پناہ وسائل کو اپنے حق میں استعمال کرسکتے تھے' مگر محض اقتدار کی حرص ان کی کمزوری بن گئی اور اس طرح وہ وسائل جو عالمِ اسلام کی طاقت بن سکتے تھے ان کو عالمی طاقتوں نے اپنے حق میں استعمال کیا۔

مثال کے طور پر یہی امریکہ بہادر جس کا مسخرہ صدر آج منہ پھاڑ کر شاہ سلمان کو دھمکیاں دے رہا ہے جب اپنی معیشت کے ضعف میں پھنسا تو ٹرمپ اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ سب سے پہلے انہی سعودی حکام کے پاس پہنچا اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر اُن سے ڈپلومیٹک بھیک مانگی۔ اس وقت اگر سعودی حکام ان کی مصنوعی مسکراہٹوں کے پیچھے چھپی فرعونیت بھانپ لیتے اور ان کے ساتھ ۴۰۰ ارب ڈالر کے معاہدے نہ کرتے تو آج امریکہ سعودی عرب کو آنکھیں نہ دکھا رہا ہوتا بلکہ اپنی گرتی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے انہی عرب ممالک کے در پر ہاتھ باندھے کھڑا

ہوتا۔ مگر افسوس! ہمارے حکمرانوں کی باہمی چپقلش، علاقائی کشمکش اور خاص طور پر حرصِ اقتدار نے انہیں بے وقوفی کی حد تک اغیار پر اعتماد کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی دشمن کی کمزوریوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، جبکہ دشمن ہماری انہی بے وقوفیوں کی وجہ سے ہمارے ہی وسائل استعمال کر رہا ہے۔

آج کوئی ریاست کتنی ہی بڑی عالمی طاقت کیوں نہ ہو، اس کی قوت کا اصل انحصار اس کی معیشت پر ہوتا ہے۔ امریکی معیشت کا دارومدار اسلحہ کی فروخت پر ہے اور امریکی اسلحہ کا سب سے بڑا خریدار سعودی عرب اور اس کے بعد مڈل ایسٹ کے دوسرے عرب ممالک ہیں۔ عجیب بات ہے کہ امریکہ کی دال بھی سب سے زیادہ اسی خطے میں گلتی ہے، جبکہ دنیا کے باقی کسی خطے کے ممالک امریکہ کو اب اتنا منہ نہیں لگاتے۔ عرب ممالک اگر امریکی اسلحہ خریدنا بند کر دیں تو امریکی معیشت چند عشروں میں نہیں بلکہ چند سالوں میں بیٹھ جائے گی اور اس کے ساتھ ہی امریکہ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔

سعودی حکام نے ٹرمپ کے مکروفریب میں آ کر ۴۰۰ ارب ڈالر کے جو معاہدے امریکہ کے ساتھ کیے وہ مسلم ممالک کے ساتھ بھی ہو سکتے تھے۔ ضرورت کا اسلحہ پاکستان سے بھی خریدا جاسکتا تھا اور جو پاکستان میں نہیں بنتا وہ چائنا اور روس سے بھی خریدا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دفاعی معاہدے پاکستان اور ترکی کے ساتھ بھی ہو سکتے تھے۔ اس طرح آپس کی تجارت اور دفاعی معاہدوں سے ایک طرف مسلم ممالک مضبوط ہوتے اور دوسری طرف امریکہ کی عالمی اجارہ داری خود اس کی معاشی گراوٹ میں اُلجھ کر رہ جاتی اور یوں طاقت کے عالمی توازن کو قائم کرنے میں بھی مدد مل سکتی۔

دوسری سب سے اہم بات جو خود سعودی ولی عہد کے منہ سے نکلی وہ یہ تھی کہ ''سعودی عرب ایران سے بات چیت بھی شروع کر سکتا ہے''۔ اصل میں یہی سب سے بڑی بیماری کا حل ہے۔ طاغوتی طاقتیں عالَمِ اسلام پر قبضہ و اجارہ داری قائم کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئی تھیں جب تک کہ انہوں نے مسلمانوں میں ایران و عرب کی تقسیم نہیں ڈالی تھی اور یہی تقسیم آج تک بھی طاغوتی طاقتوں کی عالم اسلام پر اجارہ داری کی اصل وجہ ہے۔ امریکہ سعودی عرب کو ایران کا ہوا دکھا کر اس سے دفاعی معاہدے کرتا ہے اور سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک ایران سے

مقابلہ کے لیے امریکہ سے اسلحہ خرید کر اس کی معیشت کو مضبوط کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایران پر اقتصادی پابندیوں کا باعث بھی یہی باہمی چپقلش بن رہی ہے اور اس ساری صورتحال سے فائدہ صرف عالمی طاقتیں اُٹھا رہی ہیں، جبکہ مسلم ممالک کا نقصان پر نقصان ہو رہا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ سعودی حکام یہ سب سمجھنے کے باوجود کہ اگر وہ ایران سے بات چیت شروع کر دیں تو انہیں امریکہ کی ضرورت نہیں رہے گی، وہ صرف امریکہ کو منانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ شاید مسلم حکمرانوں کی نفسیات میں خوئے غلامی اتنی رچ بس گئی ہے کہ وہ کسی سہارے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امریکہ کے متبادل کے طور پر روس کو اڈے دینے کی بات بھی کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ بیان محض سفارتی ہتھکنڈا ہے مگر غلامانہ ذہنیت کی خوب عکاسی بھی کر رہا ہے۔ حالانکہ سب سے بہتر حل یہی ہے کہ بیماری کو اُس کی جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے، یعنی ایران و عرب کی جس تقسیم کو عالمی طاقتیں مسلم ممالک کو بلیک میل کرنے کے لیے بطور حربہ استعمال کر رہی ہیں، اس تقسیم کو سرے سے ختم کر کے ایک بار پھر مسلمان ممالک متحد ہو جائیں یا کم از کم باہم بات چیت شروع کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

آپ صدیوں تک لڑتے رہیں، لیکن بالآخر جب آپ کو ہوش آئے گا کہ ہم نے اُمتِ مسلمہ کو تباہی سے بچانا ہے تو آپ کو اس کے لیے متحد ہونا ہوگا۔ لہٰذا جو کام مسلسل تباہی کے بعد کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کر لیا جائے۔ یورپ نے صدیوں تک خانہ جنگی کے بھیانک نتائج بھگت کر دیکھ لیے اور بالآخر دو عالمی جنگوں میں اپنے وسائل اور انسانی آبادیوں کو جھونک کر عقل ٹھکانے آئی کہ آپس کی جنگ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ آج وہی یورپی ممالک یورپی یونین کی صورت میں متحد ہو کر دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسلم ممالک بھی اگر اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لیں تو عالمی طاقتوں کی اجارہ داری اور بلیک میلنگ سے نکل آئیں گے، پھر یہ کہ یہی تجارتی اور دفاعی معاہدے وہ آپس میں کر کے باہم مضبوط ہوں گے اور عوام بھی خوشحال ہوں گے۔ گویا دہرا فائدہ حاصل ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں کسی بیرونی سہارے یا بیساکھی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عالمی قوتیں خصوصاً امریکہ عالم اسلام کو متحد نہیں دیکھنا چاہتا اور مسلم ممالک میں انتشار پیدا کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ اور یقیناً عالم اسلام کا اصل مسئلہ باہمی انتشار ہے۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الصّٰفّٰت

تمہیدی کلمات

سورۃ الصّٰفّٰت کا آغاز جس انداز سے ہو رہا ہے قرآن حکیم کی مزید چار سورتوں کا آغاز بھی بالکل اسی انداز سے ہوتا ہے‘ یعنی سورۃ الذّٰریٰت‘ سورۃ المُرسلٰت‘ سورۃ النّٰزعٰت اور سورۃ العٰدیٰت۔ ان پانچوں سورتوں کے آغاز میں ایک جیسے انداز میں قسمیں کھائی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض مقامات پر مفسرین کے درمیان اشکال پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی مقام پر اگر کچھ مفسّرین کا خیال ہے کہ ان قسموں میں فرشتوں کا ذکر ہے تو بعض دوسرے مفسرین کی رائے ہے کہ ان سے ہوائیں مراد ہیں۔ بہرحال سورۃ الصّٰفّٰت کی ان ابتدائی آیات کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں فرشتوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔

سورۃ الصّٰفّٰت کے بارے میں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانے کی سورت ہے اور اس کا انداز سورۃ الحجر اور سورۃ الشعراء سے مشابہت رکھتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آیات‘ تیز ردھم اور نمایاں صوتی آہنگ (جسے میں ’’ملکوتی غنا‘‘ اور Divine Music کہا کرتا ہوں) ان تینوں سورتوں کی مشترکہ خصوصیات ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکی سورتوں کے ہر گروپ کے اندر ابتدائی زمانے کی ایک سورت بھی رکھ دی ہے۔ اس کی حکمت جواب تک میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے (ممکن ہے کوئی اور بڑی حکمت بھی ہو جو اب تک ہماری سمجھ میں نہ آئی ہو) کہ فطری طور پر انسان یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے۔ انسانی فطرت کی اس کمزوری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے سورتوں کو ترتیب دیتے ہوئے اسلوب اور مضامین میں تنوع پیدا کیا گیا ہے تاکہ مسلسل پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس نہ کرے۔ مثلاً ایک شخص اگر روزانہ قرآن کے ایک پارے کی تلاوت کرتا ہے تو اسے مسلسل کئی دن تک ایک جیسے اسلوب کے ساتھ ایک جیسے مضامین ہی پڑھنے کو نہ ملیں‘

بلکہ اس کے ذوقِ تنوع کی تسکین کے لیے مضامین اور اسلوب بدل بدل کر اس کے سامنے آئیں۔ واللہ اعلم!

آیات ۱ تا ۱۰

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝۸ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝۹ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰

آیت ۱ ﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱﴾ ’’قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو قطار در قطار صفیں باندھے حاضر رہتے ہیں۔‘‘

گویا وہ بارگاہِ خداوندی میں ہمہ وقت حاضر رہنے والے خادمین ہیں جو احکامات کی تعمیل کے لیے ہر لمحہ کمر بستہ رہتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲﴾ ’’پھر قسم ہے اُن کی جو ڈانٹنے والے ہیں۔‘‘

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بستی پر عذاب کا حکم دیتا ہے تو فرشتوں کی ایک ڈانٹ (صَیحَۃ) سے وہ بستی تباہ اور متعلقہ قوم ہلاک ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ یٰسٓ میں ایک قوم کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝۲۹﴾ ’’وہ تو بس ایک زوردار چنگھاڑ تھی‘ تو اسی وقت وہ سب بجھ کر رہ گئے۔‘‘

آیت ۳ ﴿فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳﴾ ’’پھر قسم ہے اُن کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی۔‘‘

یعنی اللہ کا جو کلام انبیاء و رسل علیہم السلام پر نازل ہوتا ہے اسے فرشتے ہی لے کر آتے ہیں —— اب اگلی آیت میں ان قسموں کے مقسم علیہ کا ذکر ہوا ہے۔ یعنی یہ تمام فرشتے اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۴ ﴿اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾ ’’یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔‘‘

جیسے کہ قبل ازیں بھی ذکر ہوا ہے' ان سورتوں (زیر مطالعہ گروپ) کا مرکزی مضمون توحید اور ردِّ شرک ہے۔ اسی لیے یہاں ان قسموں کی گواہی کے بعد جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے وہ معبودِ حقیقی کے اکیلے اور تنہا ہونے کے بارے میں ہے۔ البتہ اس کے بعد مکی سورتوں کے جو آخری دو گروپس ہیں ان کا مرکزی مضمون چونکہ انذارِ آخرت ہے' اس لیے ان گروپس کی جن سورتوں کے آغاز میں ایسی قسمیں کھائی گئی ہیں وہاں ان قسموں کے بعد مقسم علیہ کے طور پر ﴿وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾ (الذّٰریٰت) (جزا و سزا اور حساب کتاب کا معاملہ یقیناً ہونے والا ہے) جیسی آیات آئی ہیں۔

آیت ۵ ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵﴾ ''جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اور تمام مشرقوں کا۔''

یہاں ''مشارق'' کے بعد ''مغارب'' کا ذکر نہیں ہوا☆۔ اس لیے کہ زمین کا ہر مقام اور ہر نقطہ مشرق بھی ہے اور مغرب بھی۔ یعنی اگر ہم کسی وقت سورج کو کسی مقام پر غروب ہوتا دیکھ رہے ہیں تو عین اسی وقت اسی مقام سے کسی دوسرے علاقے کے لوگ اسے طلوع ہوتا بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے سورج کے طلوع و غروب کے حوالے سے مشرق اور مغرب کا ذکر الگ الگ بھی ہوسکتا ہے اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ زمین کے تمام مقامات مشارق ہی ہیں۔ یعنی ہر جگہ سے کسی نہ کسی وقت سورج طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔

آیت ۶ ﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ۨ الْکَوَاکِبِ ۝۶﴾ ''ہم نے مزیّن کر دیا ہے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زیبائش سے۔''

السَّمَاءَ الدُّنْیَا مرکب توصیفی ہے' یعنی سب سے قریب والا آسمان۔ دَنَا یَدْنُو کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور اسی سے ادنٰی ہے یعنی ''قریب ترین'' جبکہ ''دُنْیَا'' کا لفظ اس کا مؤنث ہے۔

آیت ۷ ﴿وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷﴾ ''اور حفاظت کی خاطر ہر سرکش شیطان سے۔''

☆ سورۃ المعارج میں ''مشارق'' کے ساتھ ''مغارب'' بھی مذکور ہے! ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾ (آیت ۴۰) ''پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں تمام مشرقوں اور مغربوں کے رب کی'' (مرتب)

یہ مضمون قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۱۷ کے ضمن میں اس کی وضاحت قدرے تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ بہرحال اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جِنّات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور میری رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ ان کو سورج کی آگ کی لپٹ سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی لیے نظامِ شمسی کی حدود میں جِنّات آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں کسی اہتمام یا کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جیسے پرندے فضا میں آسانی سے اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں اسی طرح جِنّات بھی نظامِ شمسی کی پوری فضا یا حدود میں اپنی مرضی سے جہاں چاہیں آجا سکتے ہیں۔ البتہ نظامِ شمسی کی حدود سے تجاوز کرنے کی انہیں اجازت نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض سرکش جِنّات عالَمِ بالا کے معاملات کی سُن گُن لینے کے لیے اپنی حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیق کے اعتبار سے جِنّوں اور فرشتوں میں چونکہ قرب پایا جاتا ہے (فرشتے نوری ہیں اور یہ ناری) اس لیے شیاطین جِن فرشتوں سے رابطہ کرنے اور کسی نہ کسی حد تک ان سے کچھ معلومات اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے عالم بالا سے احکام لے کر جب آسمانِ دنیا کی طرف نزول کرتے ہیں تو شیاطین جن ان سے کچھ معلومات قبل از وقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے حفاظتی انتظام کر رکھا ہے۔ خصوصی طور پر نزولِ وحی کے زمانے میں اس حفاظتی نظام کو غیر معمولی طور پر فعال کیا جاتا رہا ہے۔

آیت ۸ ﴿لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی﴾ ''وہ سن نہیں پاتے ملأ اعلیٰ کی باتیں''

اصل میں یہ فعل یَتَسَمَّعُوْنَ (باب تفعّل) تھا' جو یَسَّمَّعُوْنَ بن گیا ہے۔

﴿وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ ۝۸﴾ ''اور ان کو مار پڑتی ہے ہر طرف سے۔''

عالَمِ بالا تک ان کی رسائی کو روکنے کے لیے ان پر میزائل فائر کیے جاتے ہیں۔

آیت ۹ ﴿دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝۹﴾ ''بھگانے کے لیے' اور ان کے لیے (پھر) ایک دائمی عذاب ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰﴾ ''سوائے اس کے کہ جو کوئی اُچک لے کوئی چیز تو اس کا پیچھا کرتا ہے ایک چمکتا ہوا انگارہ۔''

یعنی ان میں سے جو کوئی اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہوا پایا جاتا ہے وہ اس میزائل کا شکار ہو جاتا ہے۔

آیات ۱۱ تا ۲۶

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ
لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً
يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا
وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ
دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا
هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾
اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ لَا
تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾

آیت ۱۱ ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) ان سے پوچھئے کہ کیا ان کی تخلیق زیادہ مشکل ہے یا وہ کچھ جو ہم نے پیدا کیا ہے!‘‘

یہ کفار و مشرکین کہتے ہیں کہ مرجانے کے بعد ان کا پھر سے زندہ ہو جانا کیسے ممکن ہے؟ آپ ﷺ ان سے پوچھیں کہ تم جیسے انسانوں کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا اس وسیع و عریض کائنات کو بنانا؟ اور یہ کہ جس اللہ نے یہ کائنات پیدا کی ہے‘ اس کے اندر سورج اور چاند کا نظام بنایا ہے‘ سیاروں‘ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیائیں آباد کی ہیں‘ کیا تم اس اللہ کے بارے میں خیال کرتے ہو کہ وہ تمہیں پھر سے پیدا نہیں کر سکے گا!

﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾﴾ ’’ان کو تو ہم نے پیدا کیا ہے ایک لیس دار گارے سے۔‘‘

یعنی وہ ایسا گارا تھا جس میں عمل تخمیر (fermentation) کی وجہ سے چپچپاہٹ اور لیس پیدا ہو چکی تھی۔ واضح رہے کہ انسان کے مادۂ تخلیق کے بارے میں قرآن نے مختلف مقامات پر تُراب (مٹی)‘ طِین (گارا)‘ طِینٍ لَّازِب (لیس دار گارا)‘ صَلصالٍ مِّن حمإٍ مسنون (سڑا ندوالا گارا) اور صلصالٍ کالفخّار (ٹھیکری جیسی کھنکھناتی ہوئی مٹی) کے

الفاظ کا ذکر کیا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الحجر: ۲۶ کی تشریح)۔

آیت ۱۲ ﴿بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’بلکہ (اے نبی ﷺ!) آپ تعجب کرتے ہیں اور یہ لوگ تمسخر کرتے ہیں!‘‘

آپ ﷺ کو بجا طور پر ان کے رویّے پر تعجب ہوتا ہے یہ سوچتے ہوئے کہ میں تو انہیں اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں‘ انہیں توحید کی طرف بلاتا ہوں‘ اس توحید کی طرف جس کا ایک واضح تصور ہر انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر بھی موجود ہے‘ جبکہ یہ لوگ میری ان باتوں پر غور کرنے اور میری اس دعوت کو قبول کرنے کے بجائے اُلٹا اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ’’اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ’’اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾﴾ ’’اور کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ نہیں مگر ایک کھلا جادو۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’(وہ کہتے ہیں) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا؟‘‘

مرنے کے بعد انسانی گوشت تو جلد ہی گل سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے‘ لیکن ہڈیوں کا الگ سے ذکر اس لیے ہوا ہے کہ یہ سخت ہوتی ہیں اور بوسیدہ ﴿عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾﴾ (النّٰزعٰت) ہو جانے کے باوجود بھی لمبے عرصے تک موجود رہتی ہیں۔

آیت ۱۷ ﴿اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور کیا پہلے زمانے کے ہمارے آباء و اَجداد کو بھی!‘‘

تو کیا ہمارے ان آباء و اَجداد کو بھی زندہ کر لیا جائے گا جنہیں فوت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں اور ان کی ہڈیاں تک بھی مٹی میں تحلیل ہو چکی ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ ’’آپ کہیے: ہاں! (تم اٹھائے بھی جاؤ گے) اور تم ذلیل بھی ہو گے۔‘‘

نہ صرف تم سب کو اٹھا لیا جائے گا بلکہ اس وقت تمہیں اپنے اس کفر اور انکار کے باعث ذلت وخواری کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔

آیت ۱۹ ﴿فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَاِذَا هُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''بس وہ ایک زور کی ڈانٹ ہوگی' تو جبھی وہ (زندہ ہو کر) دیکھنے لگیں گے۔''

ہماری طرف سے ایک زوردار ڈانٹ کی صورت میں حکم دیا جائے گا جس کی تعمیل میں تمام انسانوں کے ذراتِ اجسام آنِ واحد میں مجتمع ہو کر جیتے جاگتے انسانوں کی صورت اختیار کر لیں گے۔

آیت ۲۰ ﴿وَقَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا هٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور وہ کہیں گے: ہائے ہماری شامت' یہ تو بدلے کا دن ہے!''

یہ تو وہی جزاء وسزا کا دن آ گیا ہے جس کے بارے میں ہمیں بار بار بتایا جاتا تھا اور ہم بار بار اس کی نفی کرتے تھے۔

آیت ۲۱ ﴿هٰذَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِهٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''(اُس وقت انہیں کہا جائے گا: ہاں) یہ وہی فیصلے کا دن ہے جس کو تم لوگ جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۲۲ ﴿اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ ''(پھر حکم دیا جائے گا) جمع کرو ان سب ظالموں کو اور ان کے ساتھیوں کو اور ان کو بھی جن کی یہ لوگ پوجا کیا کرتے تھے' اللہ کے سوا''

پھر فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان کافروں' مشرکوں اور ہر طرح کے مجرموں کو' چاہے وہ انسانوں میں سے ہوں یا جنوں میں سے' سب کو ایک جگہ جمع کر لو اور ان کے جھوٹے معبودوں کو بھی ساتھ ہی لے آؤ۔

آیت ۲۳ ﴿فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۲۳﴾﴾ ''پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ!''

اب ذرا جہنم کے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کرو' ان کو escort کرو۔

آیت ۲۴ ﴿وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور انہیں ذرا روکو! ابھی ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔''

آیت ۲۵ ﴿مَا لَکُمۡ لَا تَنَاصَرُوۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

دُنیا میں تو تمہارے جتھے بہت طاقتور تھے' وہاں تو تمہیں اپنی محفلوں اور ان کے شرکاء پر بڑا غرور تھا' وہاں تو یہ ابوجہل بہت فخر سے کہا کرتا تھا کہ دیکھو میری مجلس کس قدر آباد ہے (مریم:۷۳) اور دیکھو میرے ہاں کیسے کیسے لوگ آ کر بیٹھتے ہیں۔ تو آج وہ تمہارے جتھے دار اور حمایتی سب کے سب بے بس کیوں ہو گئے ہیں؟ اب تم ایک ہی حکم پر جہنم کی طرف کیوں چل پڑے ہو؟ اب تم آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کر رہے ہو؟

آیت ۲۶ ﴿بَلۡ هُمُ الۡیَوۡمَ مُسۡتَسۡلِمُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''بلکہ آج تو یہ بہت فرمانبردار بنے ہوئے ہیں!''

آج تو یہ بغیر کسی مزاحمت کے اپنے آپ کو حوالے کر کے بلا چون و چرا سزا کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

آیات ۲۷ تا ۴۷

وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوۡۤا اِنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَاۡتُوۡنَنَا عَنِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۲۸﴾ قَالُوۡا بَلۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۹﴾ۚ وَمَا کَانَ لَنَا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ۚ بَلۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا طٰغِیۡنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَیۡنَا قَوۡلُ رَبِّنَاۤ ٭ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوۡنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغۡوَیۡنٰکُمۡ اِنَّا کُنَّا غٰوِیۡنَ ﴿۳۲﴾ فَاِنَّهُمۡ یَوۡمَئِذٍ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا کَذٰلِکَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمۡ کَانُوۡۤا اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ۙ وَیَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجۡنُوۡنٍ ﴿۳۶﴾ؕ بَلۡ جَآءَ بِالۡحَقِّ وَصَدَّقَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّکُمۡ لَذَآئِقُوا الۡعَذَابِ الۡاَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾ۚ وَمَا تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۹﴾ۙ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴۱﴾ۙ فَوَاکِهُ ۚ وَهُمۡ مُّکۡرَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾ۙ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ﴿۴۳﴾ۙ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۴۴﴾ یُطَافُ عَلَیۡهِمۡ بِکَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ﴿۴۵﴾ۙ بَیۡضَآءَ لَذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۴۶﴾ۚۖ لَا فِیۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا یُنۡزَفُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ

الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ
الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ
اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ
لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾
اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾
لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا
جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا
كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾
ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾
اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ
قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾

آیت ۲۷ ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور پھر وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے پوچھنے لگیں گے۔''

آیت ۲۸ ﴿قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾﴾ ''کہیں گے کہ تم ہی تو آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے دبدبے کے ساتھ!''

یعنی تم ہمارے سردار تھے اور اپنی اس حیثیت کا رعب جما کر ہمیں اپنی پیروی پر مجبور کیا کرتے تھے۔ تم ہمارے پاس بہت رعب' دبدبے' طاقت اور زور کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ لفظ ''یمین'' کے معنی طاقت کے بھی ہیں اور داہنی طرف کے بھی۔ چنانچہ آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے کہ ''تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس دائیں طرف سے۔''

آیت ۲۹ ﴿قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''وہ کہیں گے (کہ نہیں!) بلکہ تم لوگ خود ہی ایمان لانے والے نہیں تھے۔''

آیت ۳۰ ﴿وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''اور ہمیں تم پر کوئی اختیار تو تھا نہیں' بلکہ تم خود ہی حد سے بڑھ جانے والے لوگ تھے۔''

آیت ۳۱ ﴿فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۚ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''تو اب ثابت ہو گیا ہے ہم پر ہمارے رب کا قول' اب تو ہمیں (عذاب کا) مزہ چکھنا ہی ہو گا۔''

اللہ تعالیٰ نے تو واضح طور پر فرما دیا تھا: ﴿لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾ (السجدۃ) ''میں بھر کر رہوں گا جہنم کو تمام (نافرمان) جنّوں اور انسانوں سے''۔ تو اللہ تعالیٰ کا وہ قول اب ہم پر واقع ہو چکا ہے اور ہم جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں۔

آیت ۳۲ ﴿فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''تو ہم نے تم لوگوں کو گمراہ کیا' ہم خود بھی تو گمراہ تھے۔''

تم لوگ درست کہتے ہو کہ ہم نے تمہیں گمراہ کیا تھا' لیکن ایسا تو نہیں تھا کہ ہم خود ہدایت پر تھے اور تمہاری گمراہی کا باعث بنے۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم خود بھی گمراہ تھے اس لیے تم لوگوں کو بھی ہم اسی تباہی کے راستے پر لے آئے۔

آیت ۳۳ ﴿فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''تو اس دن وہ سب کے سب عذاب میں شریک ہوں گے۔''

آیت ۳۴ ﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''یقیناً ہم مجرموں کے ساتھ ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''ان کا معاملہ یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ استکبار کرتے تھے۔''

جب بھی ان کے سامنے کلمہ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر کیا جاتا تو وہ اپنے گھمنڈ میں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

آیت ۳۶ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک مجنون شاعر کی خاطر چھوڑ دیں!''

حضور ﷺ کی شان میں یہ لوگ ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ان کے کہنے پر اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہم کئی نسلوں سے پرستش کرتے آئے ہیں!

آیت ۳۷ ﴿بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''بلکہ وہ تو حق لے کر آئے اور انہوںؑ نے تصدیق کی تمام رسولوںؑ کی!''

آیت ۳۸ ﴿اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾﴾ ''اب تمہیں یقیناً دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔''

آیت ۳۹ ﴿وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور تمہیں بدلہ نہیں مل رہا مگر اسی کا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔''

آج اللہ کے چیدہ بندے ہی اس انجامِ بد سے محفوظ رہیں گے۔ مُخلَص (لام کی زبر کے ساتھ) کے معنی ہیں ''خالص کیا گیا''۔ یہاں وہ بندے مراد ہیں جنہیں اللہ نے خاص کر لیا ہو، جنہیں اپنے لیے چُن کر الگ کر لیا ہو۔

آیت ۴۱ ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے طے شدہ رزق ہے۔''

آیت ۴۲ ﴿فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''(یعنی) میوے، اور ان کا اکرام کیا جائے گا۔''

آیت ۴۳ ﴿فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۴۳﴾﴾ ''نعمتوں والے باغات میں۔''

آیت ۴۴ ﴿عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''وہ تختوں کے اوپر بیٹھے ہوں گے آمنے سامنے۔''

آیت ۴۵ ﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۴۵﴾﴾ ''گردش کر رہے ہوں گے ان پر (خُدّام) نفیس شراب کے پیالوں کے ساتھ۔''

وہ شراب صاف شفاف اور بغیر کسی نشے کے ہوگی۔

آیت ۴۶ ﴿بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''بالکل سفید، انتہائی لذیذ پینے والوں کے لیے۔''

آیت ۴۷ ﴿لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اس میں نہ تو سرگرانی (کی کیفیت) ہوگی اور نہ ہی وہ اس سے بہکیں گے۔''

اس مشروب کو پی کر ایک سرور کی کیفیت تو ہوگی مگر نہ تو اس سے سر بھاری ہوگا اور نہ ہی وہ

مدہوشی لائے گا اور فتورِ عقل کا باعث ہوگا۔

آیت ۴۸ ﴿وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ان کے پاس ہوں گی نیچی نگاہوں والی بڑی بڑی آنکھوں والی (بیویاں)۔''

آیت ۴۹ ﴿كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾﴾ ''گویا وہ انڈے ہوں چھپا کر رکھے گئے۔''

آیت ۵۰ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''پھر وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے سوال کریں گے۔''

آیت ۵۱ ﴿قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾﴾ ''ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی ہوا کرتا تھا۔''

آیت ۵۲ ﴿يَّقُوْلُ ءَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ''وہ کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟''

آیت ۵۳ ﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن کر رہ جائیں گے تو کیا ہمیں (زندہ کر کے) بدلہ دیا جائے گا؟''

یعنی میرا وہ ساتھی دنیا میں حیرت سے مجھے پوچھا کرتا تھا کہ کیا تم بھی محمد (ﷺ) کی ان باتوں پر یقین رکھتے ہو کہ ہمارے مرکھپ جانے اور مٹی میں مل جانے کے بعد ہمیں پھر سے زندہ کیا جائے گا اور ہمارے اچھے برے اعمال کی ہمیں سزا و جزا دی جائے گی؟

آیت ۵۴ ﴿قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾ ''(کوئی کہنے والا) کہے گا کہ کیا اب تم اسے جھانک کر دیکھنا چاہو گے؟''

یعنی جو شخص تمہیں اس طرح گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اس وقت تم اسے دیکھنا چاہو گے کہ اب وہ کس حال میں ہے؟ گویا اہل جنت کے لیے وہاں یہ بھی اہتمام ہوگا کہ وہ جس سے ملنا چاہیں مل لیں اور جو دیکھنا چاہیں دیکھ لیں۔

آیت ۵۵ ﴿فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾﴾ ''تو وہ جھانکے گا اور اسے دیکھے گا دوزخ کے عین درمیان میں۔''

آیت ۵۶ ﴿قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''وہ پکار اُٹھے گا: اللہ کی قسم، تم تو قریب

تھے کہ مجھے بھی برباد کر دیتے!‘‘

یہ تو اللہ کا مجھ پر بڑا فضل ہوا کہ میں نے تمہاری باتوں پر زیادہ دھیان دینے کے بجائے اس آواز کی طرف توجہ دی جو میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی اور میں نے اسی بات کو قبول کیا جس کو میرے دل نے حق جانا۔ ورنہ اگر خدانخواستہ میں نے کہیں تمہاری بات مان لی ہوتی تو آج میں بھی تمہارے ساتھ جہنم کے اس گڑھے میں پڑا ہوتا۔

آیت ۵۷ ﴿وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝۵۷﴾ ’’اور اگر میرے رب کی نعمت مجھ پر نہ ہوتی تو میں بھی لازماً پکڑے گئے لوگوں میں سے ہوتا۔‘‘

آیت ۵۸ ﴿اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝۵۸﴾ ’’تو کیا اب ہمیں مرنا تو نہیں!‘‘

آیت ۵۹ ﴿اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۵۹﴾ ’’سوائے ہماری اُس پہلی موت کے‘ اور اب ہمیں کوئی عذاب بھی نہیں دیا جائے گا۔‘‘

یہ اہلِ جنت کی آپس کی گفتگو کا حوالہ ہے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے کہ کیا اس کے بعد ہماری کوئی پکڑ تو نہیں ہوگی؟ کیا اب مزید کسی چھانٹی کے لیے کوئی چھلنی تو نہیں لگے گی؟ اور کیا اب ہم مطمئن ہو جائیں کہ آئندہ ہمیں کسی قسم کے عذاب کا کوئی کھٹکا نہیں ہو گا؟ اہل جنت کی ان باتوں سے ان کی سادہ لوحی‘ تواضع اور انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ جنت میں ٹھکانہ ملنے پر وہ لوگ فخر و تعلّی کا اظہار نہیں کریں گے اور یوں نہیں سمجھیں گے کہ ہم نے اپنی محنت کا پھل پایا ہے اور اب ہم یہاں ہمیشہ ہمیش دھڑلّے سے رہیں گے‘ بلکہ اپنی اس کامیابی کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ قرار دیں گے اور اس حوالے سے بار بار اس کے حضور شکر کا اظہار کریں گے۔

آیت ۶۰ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۶۰﴾ ’’یقیناً یہی بہت بڑی کامیابی ہے!‘‘

آیت ۶۱ ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝۶۱﴾ ’’ایسی ہی چیز کے لیے عمل کرنا چاہیے عمل کرنے والوں کو!‘‘

ایسی ہی کامیابی کو ہدف بنا کر ہر کسی کو دنیا میں محنت اور بھاگ دوڑ کرنی چاہیے۔ بھاگ دوڑ تو سب ہی کرتے ہیں مگر اکثر و بیشتر سب کے پیش نظر دنیا اور اس کا مال و متاع ہے۔ ہر کوئی اسی کے حصول کے لیے رات دن سرگرداں ہے اور اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے (الّا ما شاء

اللہ)۔ لیکن غور کیا جائے تو چار دن کا یہ عیش و آرام حاصل کر لینا کوئی بہت بڑی کامیابی تو نہیں‘ اور اس قسم کا عارضی ہدف کوئی قابل ذکر ہدف بھی نہیں۔ بہر حال انسان کا وقت اور خون پسینہ اتنی ارزاں چیز نہیں کہ اسے عارضی اور وقتی کامیابی کے لیے ضائع کر دیا جائے۔ ایسی قیمتی پونجی کو تو کسی بڑے ہدف کے حصول کے لیے کام میں لانا چاہیے‘ اور وہ بڑا ہدف ہے جنت اور اس کی نعمتوں کا حصول! چنانچہ تمام بھاگ دوڑ کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس ہدف کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کریں۔

آیت ۶۲ ﴿اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝۶۲﴾ ’’بھلا مہمانی کے طور پر یہ بہتر ہے یا زقوم کا درخت؟‘‘

جنت کی مذکورہ نعمتوں کے مقابلے میں اہل جہنم کی ابتدائی مہمان نوازی زقوم (تھوہر) کے درخت سے کی جائے گی۔ اس ابتدائی مہمان نوازی کی نوعیت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اہلِ جہنم کو کن حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب اختیار انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو جنت کی دائمی نعمتوں کے حصول کو اپنا ہدف بنا لے یا جہنم اور اس کے خوفناک عذابوں کے ساتھ اپنی عاقبت کو وابستہ کر لے۔

آیت ۶۳ ﴿اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝۶۳﴾ ’’ہم نے اس (درخت) کو فتنہ بنا دیا ہے ظالموں کے لیے۔‘‘

آیت ۶۴ ﴿اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝۶۴﴾ ’’وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ میں سے نکلے گا۔‘‘

یہی بات کافروں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی‘ جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ میں بھی آ چکا ہے۔ اس میں ان کے لیے آزمائش کی وجہ دراصل ان کی یہ سوچ تھی کہ جہنم کی آگ کے اندر آخر درخت کیسے اُگیں گے؟ ایسی سوچ دراصل ان لوگوں کو پریشان کرتی ہے جو آخرت کے معاملات کو بھی اس دنیا کے قوانین و ضوابط پر قیاس کرنے لگتے ہیں۔ اس حوالے سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قیامت کے بعد ایک ایسے عالَم کا ظہور ہوگا جس کے قوانین کا اس دنیا کے قوانین سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں تو انسان آگ میں جل کر مر جاتا ہے‘ مگر جہنم کی آگ جلائے گی بھی اور مرنے بھی نہیں دے گی (الاعلیٰ:۱۳)۔ اس دنیا میں انسان کی جِلد اگر ایک دفعہ آگ سے جھلس جائے تو پھر درست نہیں

ہوسکتی‘ مگر وہاں جہنمیوں کی جِلدیں جل جانے کے بعد کپڑوں کی طرح تبدیل کر دی جائیں گی (النساء:۵۶)۔

آیت ۶۵ ﴿طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾﴾ ’’اُس کے خوشے ایسے ہوں گے جیسے شیاطین کے سر۔‘‘

یعنی جسامت میں غیر معمولی طور پر بڑے‘ جبکہ دیکھنے میں بہت ہی بھدّے اور بدنما۔

آیت ۶۶ ﴿فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ’’پھر وہ اس میں سے کھائیں گے اور اسی سے اپنے پیٹوں کو بھریں گے۔‘‘

ویسے تو وہ درخت ایسا ہوگا کہ کوئی اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا لیکن‘ اہل جہنم بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر اس درخت کو کھائیں گے اور اسی سے اپنے پیٹوں کو بھریں گے۔

آیت ۶۷ ﴿ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾﴾ ’’پھر اس کے اوپر ان کے لیے گرم پانی کا آمیزہ ہوگا۔‘‘

زقوم کے برگ و بار کھانے کے بعد جب پیاس بھڑکے گی تو پیپ ملا کھولتا ہوا پانی انہیں پلایا جائے گا۔

آیت ۶۸ ﴿ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾﴾ ’’پھر ان کا لوٹ کر آنا ہے جہنم کی طرف۔‘‘

یعنی زقوم کا کھانا اور کھولتا ہوا مشروب تو ان لوگوں کو ابتدائی ’’مہمان نوازی‘‘ کے طور پر دیا جائے گا۔ اس کے بعد انہیں ان کے مستقل ٹھکانے یعنی جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک!

آیت ۶۹ ﴿اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آباء و اَجداد کو گمراہ پایا۔‘‘

آیت ۷۰ ﴿فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾ ’’تو وہ ان ہی کے نقوشِ قدم پر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔‘‘

بے شک ان کے باپ دادا گمراہ تھے‘ لیکن انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا اور بغیر سوچے سمجھے اپنے گمراہ آباء و اَجداد کے اختیار کردہ راستوں پر گامزن ہو گئے۔

آیت ۷۱ ﴿وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ’’اور ان سے پہلے لوگوں کی بھی اکثریت گمراہ تھی۔‘‘

یعنی ماضی میں بھی لوگوں کی اکثریت گمراہ ہی تھی۔ اس حوالے سے ہم سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۶ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور اگر تم پیروی کرو گے زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے لازماً گمراہ کر دیں گے‘‘۔ یہی مضمون سورۂ یوسف میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾ ’’اور ان میں اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر (کسی نہ کسی نوع کا) شرک بھی کرتے ہیں۔‘‘

گویا ہر زمانے کی اکثریت کسی نہ کسی قسم کے شرک میں ملوث رہی ہے۔ اور توحید کے ساتھ شرک کی ملاوٹ کی ابتدا ہمیشہ یوں ہوتی رہی کہ اللہ کو ایک بڑے معبود کے طور پر مان لیا جاتا‘ لیکن اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معبود بھی بنا لیے جاتے۔ پھر آہستہ آہستہ بڑا معبود اس لیے پس منظر میں چلا جاتا کہ وہ انسانی سوچ سے وراء الوراء‘ ثم وراء الوراء ہے اور پردۂ غیب میں بھی ہے‘ جبکہ چھوٹے اور خود ساختہ معبود ’’پیکر محسوس‘‘ کے طور پر ہر وقت اپنے پجاریوں کے سامنے حاضر و موجود ہوتے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ خود ساختہ معبود ہی کُلّی طور پر ان کے اعصاب پر سوار ہو جاتے۔ پھر اللہ کے بارے میں یہ لوگ یہی گمان کرتے کہ وہ تو بس اپنی ذات میں مگن ہے اور اسے کائنات کی اب کوئی فکر نہیں۔

جیسے ’’مشائین‘‘ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اسی طرح کے گمراہ کن نظریات رکھتے ہیں۔ (مشائین کے لغوی معنی ہیں چلنے پھرنے والے۔ ابتدائی طور پر اس گروہ کے لوگ چلتے پھرتے ہوئے اپنے استاد سے سیکھتے اور معلومات اخذ کرتے رہتے تھے‘ اس لیے وہ اس نام سے موسوم ہو گئے۔) اس گروہ کا ’’امام‘‘ ارسطو ہے اور ہمارے ہاں کے اکثر متکلمین (علمائے فلسفہ) بھی اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارسطو کا فلسفہ اس حوالے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف کلیات کا عالم ہے‘ جزئیات کا نہیں۔ یعنی اللہ نے اس کائنات کو پیدا کر دیا ہے‘ اس کے لیے کچھ قوانین بنا دیے ہیں اور اب یہ سارا نظام ان قوانین کے مطابق خود بخود چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کی اب نہ تو کوئی فکر ہے اور نہ ہی اب یہ اس کے کنٹرول میں ہے۔ جیسے کسی کھلاڑی نے فٹ بال کو کِک لگائی تو فٹ بال تیزی سے لڑھکنے لگا۔ (باقی صفحہ 44 پر)

نبی اکرم ﷺ بحیثیت رحمۃٌ لِلعالمین

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

۱۲ ربیع الاول کو برصغیر پاک و ہند کے مسلمان نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کے طور پر مناتے ہیں۔ شرعی اعتبار سے اس کی کیا اہمیت ہے' اس کا کیا مقام ہے اور اس کا کیا جواز ہے' اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ اگر اس دن نبی اکرم ﷺ سے عقیدت اور محبت کے جذبے سے آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ پر گفتگو ہو' آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ جاں گسل جِدّوجُہد' جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے اللہ کے دین کو قائم و غالب کیا' کا تذکرہ ہو اور اضافی طور پر آنحضور ﷺ کے مناقب اور فضائل کا بھی ذکر ہو تو یہ اپنی جگہ مفید مقصد ہے۔ اور اس کے لیے سال کا کوئی ایک دن مختص نہیں کرنا چاہیے' بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سامنے بار بار یہ باتیں لائی جائیں' لہٰذا سال بھر سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا تذکرہ ہوتے رہنا چاہیے تاکہ یہ باتیں ہمارے ذہنوں سے محو نہ ہونے پائیں۔

ہم مسلمانوں کا بجا طور پر دعویٰ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نہ صرف تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے سردار ہیں' بلکہ جملہ مخلوقات میں آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ممکن ہے کہ یہی دعویٰ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رکھتے ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ عیسائی یہی مقام حضرت مسیح علیہ السلام کو دیتے ہوں' بلکہ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو الوہیت میں شریک کر کے اللہ کے برابر لا بٹھایا ہے اور تثلیث کے عقیدے کے ذریعے انہیں توحید اور الوہیت کا ایک جزو بنا دیا ہے۔ انہوں نے توحید کو پہلے تین حصوں میں تقسیم کیا اور پھر تینوں کو جوڑ کر کہتے ہیں کہ یہ ایک ہے' یعنی ''ایک میں تین اور تین میں ایک''۔ گویا: ع ''اِک معمہ ہے سمجھنے کا' نہ سمجھانے کا!'' بہرحال عیسائی اپنے نبی اور رسول سے عقیدت و محبت میں اس حد تک افراط کا شکار ہوئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر الوہیت میں شریک کر دیا۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اصل بات یہ ہے کہ مخلوقات میں سب سے اونچا مقام کس کو ملا ہے' یہ کون بتلائے گا؟ ویسے بھی کسی عظیم المرتبت شخصیت کے مقام کا تعین تو وہی ہستی کر سکتی ہے جو خود اس شخصیت کی عظمت و مقام سے پوری طرح باخبر ہو۔ کسی اچھے ادیب اور شاعر کے مقام و مرتبہ کا تعین وہی کر سکتا ہے جو خود بلند پایہ ادیب و شاعر' بہت بڑا صاحبِ فن اور بلند پائے کا نقاد ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ کا درست تعین کر سکے؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ کسی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ بات غالبؔ نے بڑے خوبصورت انداز سے کہی ہے ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است!

یعنی سرورِ عالم ﷺ کے فضائل و مناقب ہم کیا بیان کریں' یہ چیز ہم نے خود اللہ پر چھوڑ دی ہے' اس لیے کہ وہی واحد ہستی ہے جو محمد ﷺ کے مرتبے سے کما حقہ واقف ہے۔ چنانچہ اُس ذاتِ پاک نے اپنے کلام پاک میں واضح کیا ہے کہ تمام مخلوقات میں بلند ترین مقام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہے۔ آپ ﷺ کے مناقب اور فضائل کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا ہوا ہے' لیکن قرآن کا وہ مقام جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مخلوقات میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بلند ترین مقام حاصل ہے' وہ سورۃ الانبیاء کی یہ آیت ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا''۔ ان تمام جہانوں میں یہ عالم بھی آ گیا اور وہ عالم بھی' بلکہ اس کائنات میں موجود تمام عالم آ گئے' نیز جن و انس اور ملائکہ سمیت جملہ مخلوقات بھی آ گئیں۔ یہ وہ بلند ترین مقام اور اعلیٰ ترین منصب ہے جو جملہ مخلوقات میں سے کسی اور کو عطا نہیں ہوا۔ چنانچہ شیخ سعدی نے اسی بنیاد پر بڑے خوبصورت انداز سے یہ بات کہی ہے ع ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!'' وہ رباعی جس کا یہ مصرع ہے' بڑی پیاری ہے: ؎

یا صاحبَ الجَمَالِ وَیا سَیِّدَ البَشر
مِن وَجْهِكَ المُنیرِ لقد نوّر القَمر

لا یُمکنُ الثّناء کما کان حَقُّہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

جو ذات خود سراپا رحمت ہے‘ اس نے حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو رحمۃ للعالمین قرار دیا ہے‘ چنانچہ اسی نسبت سے آج کا موضوع ’’حضور ﷺ بحیثیت رحمۃ للعالمین‘‘ ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے!

غور طلب بات یہ ہے کہ آج محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رحمت کے مظاہر موجودہ دنیا میں کہیں نظر آ رہے ہیں؟ اس ضمن میں اگر کوئی آنحضور ﷺ کی رحمۃ للعالمینی پر شک کرے گا‘ تو وہ اپنے ایمان کی خیر منائے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ یقیناً رحمۃ للعالمین ہیں۔ تاہم اصل سوال یہ ہے کہ آج مسلمانوں اور پورے عالَم کے لیے آپ ﷺ کی رحمت کس شکل میں جلوہ گر ہو رہی ہے؟ اس وقت محمد عربی ﷺ کے نام لیواؤں کو تو دہشتگرد‘ اجڈ‘ گنوار‘ جذباتی‘ غیر مہذّب‘ انتہا پسند جیسے القابات سے نوازا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مجموعی طور پر اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہیں کہ مسلمانوں کے رویوں کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر پوری دنیا حیران ہے۔ سب سے زیادہ کرپشن مسلمانوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کے نام لیواؤں کو ساری دنیا میں مار پڑ رہی ہے‘ ظلم وستم کے پہاڑ ان پر توڑے جا رہے ہیں‘ ذلّت ومسکنت ان پر مسلّط ہے۔ تو اب کوئی سوال اٹھا سکتا ہے کہ رحمت کہاں ہے؟

حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ تو اس عالَم کے لیے بھی رحمت ہیں‘ لیکن وہ رحمت کہیں نظر آ رہی ہے؟ مسلمان اس وقت آپس میں دست وگریباں ہیں‘ مسلکوں اور فرقوں کے جھگڑوں میں گرفتار ہیں‘ قومیتوں کی بنیاد پر منقسم ہیں اور کسی طور پر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسری طرف عالَمِ کفر ملّتِ واحدہ کی شکل میں متحد ہو رہا ہے۔ ایک ہی ویزے پر آپ اسکینڈے نیویا کے تمام ممالک میں جا سکتے ہیں اور کرنسی بھی وہ مشترکہ جاری کر رہے ہیں‘ جبکہ عالم اسلام میں تقسیم در تقسیم ہے۔ یہ وہ نقشہ ہے جو علامہ اقبال نے پیش کیا تھا: ؎

پیشِ ما یک عالَمِ فرسودہ است

ملت اندر خاکِ او آسودہ است

یعنی ہمارے سامنے ایک پرانا اور گھسا پٹا عالم ہے اور امت اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو سو ڈیڑھ سو سال سے چل رہی ہیں۔ مسلمان شعراء اور ان میں سے بھی بالخصوص جو امت کا درد رکھنے والے تھے‘ انہوں نے کیسے کیسے مرثیے کہے۔ مولانا حالی کے مرثیے آپ کو یاد ہوں گے ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد

دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

پھر ان کی وہ نظم جو رلا دینے والی ہے‘ اس کے اولین اشعار دیکھئے: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دُعا ہے

امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے

پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اس طویل نظم کا ایک ایک شعر رلا دینے والا ہے —— پھر علامہ اقبال نے جو مرثیے کہے ؎

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا

قبضے سے بے چاری اُمت کے دیں بھی گیا‘ دنیا بھی گئی!

آج مسلمانوں کا یہ حال کیوں ہے‘ جبکہ ہم تو محمد عربی ﷺ کے امتی ہیں‘ اس پر علامہ اقبال نے ’’شکوہ‘‘ نامی نظم لکھی۔ اس نظم میں علامہ نے مسلمانوں کے جذبات کی بہت خوبصورت ترجمانی اور عکاسی کی ہے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے تو کارنامے بہت اونچے تھے اور ان کارناموں کی وجہ سے دنیا میں ہمارا نام تھا۔ اب طویل عرصے سے ہم ذلت وخواری کا شکار ہیں۔ یہ نظم ’’بانگ درا‘‘ کے تقریباً ساڑھے دس صفحات پر مشتمل ہے‘ جس میں علامہ اقبال شکوہ کرتے کرتے شاعری کے انداز میں کافی سخت باتیں بھی کہہ گئے جس پر علماء نے ان پر گرفت بھی کی‘ لیکن ان کے اصل جذبے سے سب واقف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو قرآن وسنت کے پیغام کو درست انداز میں سمجھانے کے لیے ’’جوابِ شکوہ‘‘ میں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ایک نمائندہ بن کر جواب دیا ہے جس میں ہماری ایک ایک کوتاہی کی نشاندہی کی ہے جس کی ہمیں سزا مل رہی ہے۔ ''شکوہ'' میں وہ کہتے ہیں ؎

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

اسی نظم میں انہوں نے شکوہ کیا ہے ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر!

اس وقت دنیا کا حال یہ ہے کہ یورپی اقوام یعنی عیسائی غالب ہیں اور ان کی اکثریت بنیادی طور پر سیکولر ہو چکی ہے اور وہ کسی دین و مذہب کو نہیں مانتی۔ چونکہ ان کے آباء و اَجداد عیسائی تھے لہٰذا وہ بھی عیسائی کہلاتے ہیں' لیکن حقیقت میں وہ ملحدین ہیں۔ ان کا ایمان مادے پر ہے' کسی برتر ہستی پر ہے ہی نہیں' اور وہ کسی ہستی کو فاطر فطرت ماننے پر تیار ہی نہیں۔ یہی اقوام مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں اور ہر اعتبار سے مسلمانوں کا استحصال کر رہی ہیں۔ دوسری طرف یہ یورپی اقوام پھل پھول رہی ہیں اور دنیا میں ان کو ترقی مل رہی ہے۔

اگرچہ علامہ اقبال کی اس نظم کو سو برس ہو گئے' لیکن آج اگر غور کیا جائے تو مسلمان حقیقت کے اعتبار سے وہیں کھڑے ہیں' حالانکہ ان کے پاس بیشمار پٹرو ڈالرز آ گئے ہیں اور ان میں بیشمار دنیا کے بلینئر کلب کے ممبرز بھی ہیں' لیکن کیا ان کے لیے عزت نام کی کوئی شے ہے؟ انہیں ساری دنیا میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟ ان کے اللّوں تللّوں کے بارے میں کیا رائے رکھی جاتی ہے؟ ایٹمی قوت ہوتے ہوئے آج ہم پر جس قدر ذلت و رسوائی مسلّط ہے' کسی اور قوم کا ایسا حال نہیں ہے۔ اللہ کا وعدہ تھا: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آلِ عمران) کہ غالب تم ہی ہو گے اگر تم واقعی مؤمن ہوئے۔ ہمارا غلبہ کہاں ہے؟ چنانچہ آج بھی نظم ''شکوہ'' اسی طرح تازہ ہے جس طرح سے سو سال پہلے تھی۔ آج تو ہم اس سے بھی بدتر صورتحال سے دوچار ہیں۔ اللہ ربّ العزت نے ہمیں ایٹمی صلاحیت عطا کر دی ہے' اس کے باوجود ہماری حالت میں کوئی بہتری واقع نہیں ہوئی۔

آنحضور ﷺ کی رحمت سے ہم خود انکاری ہیں!

آج دنیا میں آنحضور ﷺ کی رحمت کے کوئی خوشگوار مظاہر کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ کوئی اللہ پر ایمان کی وجہ سے باطنی طور پر ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال ہو اور اسے قناعت و صبر کی توفیق ملی ہو تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن مسلمانوں میں کتنوں کو یہ نصیب ہے' سب کو معلوم ہے۔ اس سب کے باوجود ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ اللہ ظالم نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے تو شکوہ کرتے ہوئے حدِّ ادب سے تجاوز کر کے یہاں تک کہہ دیا تھا ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں' تو بھی تو ہرجائی ہے!

اس پر علماء نے شدید گرفت کی تھی کہ اتنی بڑی جسارت؟ لیکن جن حالات سے مسلمان دوچار تھے اس کا شدتِ جذبات کے ساتھ اظہار ہوا تھا۔ اللہ کی سنت میں یقیناً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ قرآن پاک کا ایک ایک حرف اٹل حقیقت ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا — لیکن غور کرنے پر اللہ تعالیٰ نے حقیقت کھولی کہ مذکورہ آیت کہ ''ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے'' سو فیصد درست ہے' اصل بات یہ ہے کہ ہم نے خود اس رحمت اور اس کے مظاہر سے منہ پھیر رکھا ہے۔ اس رحمت کا فیض ہم تک اس لیے نہیں پہنچتا کہ ہم خود اس کی ضرورت کے انکاری ہیں۔ میں یہ ثابت کر کے بتاؤں گا کہ ہم خود انکاری ہیں' ورنہ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

اور ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اس رحمت کے عظیم ترین مظاہر کو ہم نے پاؤں تلے روندا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ایک حدیث مبارکہ سے مجھے بڑی رہنمائی ملی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ((کُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ اَبٰی)) ''میرا ہر اُمتی جنت میں داخل ہوگا سوائے اُس کے جو خود انکار کر دے''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونک گئے اور پوچھا کہ ایسا بھی کوئی بدبخت ہوگا جو جنت میں داخلے سے انکار کر دے؟ آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ ((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی)) (صحیح البخاری) ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا خود جنت میں داخلے سے انکار کر دیا''۔ یہ تلقین کا ایک بہت خوبصورت انداز ہے۔ ہم نے تو سمجھ رکھا ہے کہ ایمان کچھ اور شے ہے' عمل کچھ اور شے ہے۔ تقویٰ اور اطاعت تو صرف مولوی کے ذمے ہے' عام مسلمانوں کے ذمے تو ہے ہی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مولوی خود اس پر کتنے پورے اُتر رہے ہیں' الا ماشاء اللہ' یہ ایک دوسرا المیہ ہے۔ دراصل رحمت ہمیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے چین ہے' لیکن ہم ہی انکار کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ساتھ پھر وہی ہونا تھا جو آج ہو رہا ہے۔

آنحضور ﷺ کی رحمت کے مظاہر

اب ہم دیکھتے ہیں کہ از روئے قرآن آنحضور ﷺ کی رحمت کے مظاہر دراصل ہیں کیا؟ آپ ﷺ محسنِ انسانیت ہیں تو آپ ﷺ کے اصل احسانات نوعِ انسانی پر کیا ہیں؟ چنانچہ جب ہم اس اعتبار سے غور کرتے ہیں تو قرآن مجید کے تین مقامات پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے مقصد کا ذکر ملتا ہے' اور جن الفاظ میں یہ ذکر آیا ہے' کسی دوسرے نبی اور رسول کے لیے نہیں آیا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹) ''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو (بین السطور میں یہ سمجھئے کہ بھیج دیا اپنے رسول ﷺ کو جن کا انتظار کائنات کو تھا اور جن کی آمد کی خوشخبری تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔) الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ اسے پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دیں''۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہی دو چیزیں یعنی الہدیٰ اور دین حق انسانوں کے لیے اللہ کی رحمت کے سب سے بڑے مظاہر ہیں اور یہ دونوں رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعے پوری نوعِ انسانی کو عطا ہوئیں۔ آیت کے آخری حصے میں جو یہ فرمایا کہ ''اسے دنیا کے دیگر تمام نظاموں پر غالب کر دیں'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلے کے ساتھ اپنے رسول ﷺ کو دین حق دے کر بھیجا ہے کہ اب یہ دین صرف کتابوں میں اور وعظ کی حد تک

نہیں رہے گا' بلکہ محمد عربی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے دنیا کے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم اور غالب ہوگا۔

''الہدیٰ'' قرآن حکیم ہے اور قرآن کے بارے میں یہ آیات تو سب کو یاد ہوں گی: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲﴾ (الرحمٰن) کہ رحمٰن نے قرآن کا علم سکھایا۔ صفتِ رحمت میں مبالغہ جب آخری درجے پر ہو تو وہ ''رحمٰن'' ہے اور رحمٰن کی رحمانیت کا سب سے بڑا مظہر ''قرآن حکیم'' ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اسے اُٹھا کر طاقِ نسیان پر رکھا ہوا ہے۔ ہر نبی اور رسول نے آ کر یہ بات بتائی کہ یہ دنیا جس میں تم نے آنکھ کھولی ہے' یہ اصل زندگی نہیں ہے۔ ہم مسلمان بھی یہ بات بھولے ہوئے ہیں کہ ہمیں دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے' یہاں کا قیام عارضی ہے' جبکہ اصل زندگی تو بہت طویل ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

اس کا آغاز تو اس وقت ہو گیا تھا جب ہم سے عہدِ الست لیا گیا تھا۔ وہ عہد ہماری فطرت کی شکل میں ہمارے اندر موجود ہے۔ یہ تو عالَمِ ارواح کی بات تھی۔ پھر ہمیں باقاعدہ تخلیق کیا گیا۔ پھر پہلی دفعہ ہمیں اس دنیا میں بھیجا گیا' لیکن بتا دیا گیا کہ یہ تمہاری منزل نہیں' عارضی قیام گاہ ہے۔ یہ عارضی قیام گاہ دراصل امتحان گاہ ہے۔ یہ موت و حیات کا سلسلہ کہ ایک شخص فلاں تاریخ کو پیدا ہوا اور فلاں تاریخ کو اس کا انتقال ہو گیا' اس کا درمیانی حصہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (المُلک:۲) ''اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے''۔ دنیا میں جو کچھ ہے اس کو زینت کا سامان بنا دیا گیا ہے تاکہ اللہ ہماری آزمائش کرے کہ انسان اسی دنیا میں غرق ہو کر رہ جاتا ہے یا اسے اللہ اور یومِ آخرت یاد رہتا ہے۔

اُخروی زندگی سے پہلوتہی

ذرا غور کریں کہ یہ کتنا گھمبیر اور سنگین امتحان ہے۔ اس لیے کہ اس کے نتیجے میں ناکامی کا خدانخواستہ سامنا کرنا پڑا تو یہ ہرگز قابلِ برداشت نہیں ہے۔ آخرت میں دو ہی انجام ہیں: جنت ہمیشہ ہمیش کی یا جہنم ہمیشہ ہمیش کی (یہ حدیث کے الفاظ ہیں: وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ

اَبَدًا) اور کوئی تیسرا امکان وہاں پر نہیں ہے۔ جس آگ میں ہم چند لمحوں کے لیے اپنی انگلی نہیں رکھ سکتے‘ اس سے سو گنا سخت آگ میں اپنے پورے وجود کا جلنا کیا ہمیں گوارا ہوسکتا ہے؟ کامیاب ہونے والوں کے لیے تو جنت کی وہ نعمتیں ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے‘ لیکن قرآن نے ساتھ یہ بھی بتادیا کہ تیزی سے گزرتا ہوا زمانہ گواہ ہے کہ انسانیت تیزی سے خسارے کی طرف جارہی ہے اور اس سے بچنے والے بہت کم ہوں گے۔

ہم جس امتحان میں ڈالے گئے ہیں‘ ہمیں نہ اس کا شعور ہے اور نہ ہی اس کی تیاری کا کوئی احساس۔ ہم چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لیے گائیڈ بکس اور ٹیوٹرز تلاش کرتے پھرتے ہیں‘ حالانکہ ان امتحانات کا بس یہ فائدہ ہے کہ آپ کا دنیوی اعتبار سے سٹیٹس بلند ہوجائے گا‘ معیارِ زندگی تھوڑا بہتر ہوجائے گا۔ یہاں کے امتحانات کے لیے آپ کے پاس آپشنز بھی ہیں۔ ایک بار کی ناکامی کے بعد دوسری بار پھر امتحان دے سکتے ہیں‘ لیکن جس امتحان میں ہمیں یہاں ڈالا گیا ہے اس کے بارے میں ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ہمارے لیے مہلت عمل کتنی ہے۔ کسی بھی لمحے بلاوا آسکتا ہے۔ خواہی نخواہی ہمیں وہاں پہنچنا ہے‘ اللہ کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہے اور پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ایک ایک عمل کی اور زبان سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ کی جواب دہی ہونی ہے۔ اس امتحان کے لیے انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسے اعلیٰ ترین گائیڈ بک مل جائے تاکہ ناکامی کا کوئی امکان نہ رہے۔ اسے ہر اعتبار سے پرفیکٹ گائیڈ بک چاہیے‘ اعلیٰ ترین ٹیوٹر چاہیے۔ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے‘ وہ کہتے ہیں کہ ع ’’بابر بعیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست‘‘ تقریباً ہمارا حال بھی وہی ہے۔ ہمیں ساری فکر دنیا کی ہے کہ یہاں کا مستقبل سنوارو۔ اولاد کو بھی ہم یہی بتارہے ہیں کہ تمہارے پاس وقت ہے‘ چند سال جو تمہیں میسر ہیں‘ ان میں طبیعت پر جبر کر کے اپنی پڑھائی پر محنت کرو تاکہ تمہارا مستقبل بن جائے۔ اس کے مقابلے میں اصل مستقبل کو ہم بھولے بیٹھے ہیں۔

قرآن حکیم: رحمت کا سب سے بڑا مظہر

نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان یہ ہوا کہ اسے کامل ترین گائیڈ بک قرآن حکیم اور اعلیٰ ترین گائیڈ محمدؐ رسول اللہ ﷺ میسر آئے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے بارے میں فرمایا کہ یہ وہ دولت ہے جس پر تمہیں چاہیے کہ تم جشن مناؤ۔ مجھے اور کہیں نظر نہیں آیا کہ دنیا میں جتنی

چیزیں انسان کو ملی ہیں‘ ان میں سے کسی اور چیز پر جشن منانے کا قرآن میں کہیں ذکر آیا ہو۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ’’اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی جانب سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا‘ اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت‘‘۔ سینوں میں جو بیماریاں ہیں جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے‘ یعنی مال اور دنیا کی محبت‘ لالچ‘ ہوس‘ حرص وغیرہ کا علاج بھی اسی قرآن میں ہے‘ کیونکہ یہ سب امراض آخرت کے راستے کی رکاوٹ بنتے ہیں۔ قرآن ان سب کا علاج بھی ہے اور سراپا ہدایت بھی‘ اور جو اس پر صحیح معنوں میں ایمان لے آئیں تو یہ ان کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔ اللہ کی رحمت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ خود قرآن ہے۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ یہ قرآن اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے‘‘۔ ہمیں سب سے زیادہ ضرورت اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی ہے‘ جب کہ ہر رحمت اور فضل کو جمع کریں تو اس کا حاصل قرآن ہے۔ یہی اللہ کی رحمت اور فضل کا نقطۂ عروج ہے۔ جو کچھ بھی انسان جمع کرسکتا ہے اس میں سب سے بہتر قرآن ہے۔ کاش کہ آج کے انسان کو یہ بات سمجھ میں آجائے۔ اس کا تعلق ہماری ابدی زندگی سے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے امتحان گاہ ہی میں ہمیں جنت مل جائے‘ اسی لیے اس کا رحمت ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آج قرآن کے ساتھ ہمارا رشتہ علامہ اقبال کے الفاظ میں بس یہی رہ گیا ہے:

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

اے مسلمان! تجھے قرآن کے ساتھ اس کے سوا کوئی سروکار نہیں کہ مرتے ہوئے شخص کو سورۂ یٰسین سنا دی جائے تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔ غالباً علامہ اقبال کے دور میں قرآن خوانی کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا‘ ورنہ وہ اس کا بھی ذکر کرتے۔ لیکن ہم نے اسی جانب ایک قدم اور بڑھا دیا۔ مرنے والے کے لیے دوسرے یا تیسرے دن ہم قرآن خوانی بھی کرتے ہیں۔ قرآن کا ایک مصرف یہ بھی ایجاد کرلیا گیا ہے۔ گویا زندوں کے لیے اس میں کچھ نہیں ہے‘ سارا کچھ مُردوں کے لیے ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں زندگی کے ہر ہر گوشے کے

لیے رہنمائی موجود ہے۔ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ایمانِ حقیقی یعنی یقین والے ایمان کی ہے‘ لیکن ہم موروثی مسلمان ہیں اور ہمارا ایمان بھی موروثی ہے۔اس کا حقیقت یعنی قلب سے کوئی تعلق نہیں۔قلبی طور پر ہمارا سارا ایمان نفع ونقصان کے حوالے سے اس دنیا پر ہے‘ جبکہ اللہ کے سارے وعدے حقیقی ایمان والوں کے لیے ہیں کہ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝﴾ ’’(دنیا میں) تم ہی سربلند ہو گے اگر تم واقعی مؤمن ہوئے‘‘۔سورۃ الحدید بتاتی ہے کہ کچھ نام کے مسلمان ہیں‘ وہ پیچھے رہ جائیں گے۔جن کے دلوں میں یقین قلبی والا ایمان کا نور ہوگا وہ پل صراط کو پار کر سکیں گے۔باقیوں کا انجام کفار کے ساتھ ہوگا۔

یقین کا منبع وسرچشمہ بھی یہ کتاب ہے۔اس کی تلاوت کرو‘ اس کو سمجھو اور اس پر غور کرو ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

اس سے پہلے بھی کتابیں اُترتی رہی ہیں لیکن کامل ترین ہدایت نامہ یہ قرآن ہے۔وہ ساری کتابیں عبوری دور کے لیے تھیں‘ اسی لیے اللہ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔قرآن میں قیامت تک ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہوگا۔یہ کتاب اس شان سے عطا ہوئی ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے اُمت کو عطا ہوئی۔

دینِ حق: رحمت کا دوسرا بڑا مظہر

رحمتِ الٰہی کا دوسرا بڑا مظہر ’’دینِ حق‘‘ ہے جو نوعِ انسانی کو رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعے عطا ہوا ہے۔یہ دنیا میں زندگی گزارنے کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جس میں ہر سطح پر عدل وانصاف ہے۔اس کے ذریعے دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو وہ سازگار ماحول میسر آتا ہے جس میں وہ نارمل رہ کر کامیاب ہو سکے۔جس معاشرے میں عدل وانصاف نہیں ہوتا وہاں کے لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔کسی کا دماغ اس وقت گھومتا ہے جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ دھونس اور دھاندلی کے ساتھ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے۔آج ہم جس آگ میں جل رہے ہیں اس کا اصل سبب یہی ہے۔لوگ درپیش حالات کی بنا پر نارمل نہیں رہے‘ بلکہ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔عدل وانصاف ہوگا تو دنیا میں لوگوں کو ایک بہتر معاشرہ میسر آئے گا جہاں رہ کر وہ زندگی کے امتحان میں بہتر طریقے سے اپنی کامیابی کے بارے میں سوچ سکیں گے۔چنانچہ

بنی نوع انسان کو ایسا نظام چاہیے کہ دنیا کو اس اعتبار سے جنت بنایا جائے کہ یہاں ناانصافی نہ ہو‘ ظلم واستحصال نہ ہو۔

اسلام وہ کامل نظام ہے جس میں کوئی ظلم و جبر اور استحصال نہیں۔یہ ہر سطح پر عدل و انصاف کی کامل ضمانت دیتا ہے۔یہ کامل نظام محمد عربی ﷺ کو عطا ہوا جسے آپ ﷺ نے ۲۳ سالہ جدوجہد کے نتیجے میں قائم کیا اور اس کے لیے جہاد اور قتال بھی ہوا۔جب ۸ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝۸۱﴾ (بنی اسرائیل) ’’حق آ گیا اور باطل مٹ گیا‘ بیشک باطل ہے ہی مٹنے کے لیے‘‘۔یہ نظام ایک بہت بڑا تحفہ ہے جو نوعِ انسانی کو عطا ہوا ہے جس کی دنیا اس وقت محتاج ہے۔اس وقت ہر سطح پر استحصال ہے۔مغربی ممالک میں آپ کو بظاہر بڑی خوشحالی نظر آئے گی‘ لیکن یہ خوشحالی کس قیمت پر انہیں ملی ہے؟ ان کی آخرت برباد کر دی گئی ہے اور انہیں شرفِ انسانیت سے گرا دیا گیا ہے۔وہاں بے حیائی‘ عریانی اور فحاشی کا دور دورہ ہے‘ خاندانی نظام تباہ وبرباد ہو چکا ہے اور انسان حیوان بن چکا ہے۔وہاں سودی نظام اپنے عروج پر ہے اور غریب طبقات کولہو کے بیل بنے ہوئے ہیں۔اسلام ہی عدل وانصاف کا بہترین نظام ہے۔اس نظام کے بارے میں بنیادی رہنمائی قرآن میں موجود ہے‘ لیکن اس کا تفصیلی خاکہ محمد عربی ﷺ کی احادیث وفرامین نے قائم کیا ہے اور پھر اسی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آگے پہنچایا ہے۔رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی طرف مراجعت کی جلدی تھی کہ جیسے ہی جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کا دین قائم ہوا اُس وقت آپ ﷺ کو اختیار ملا تھا کہ آپ چاہیں تو مزید وقت مل جائے‘ لیکن آپ ﷺ نے اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى کے اختیار کو قبول فرمایا۔

جو نظام آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا کر گئے تھی وہ ابھی بند کلی کی شکل میں تھا‘ اور وہ دورِ فاروقی میں اپنی پوری رعنائی کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔اس نظام میں انسانوں کے حقوق اور ان کے جان و مال اور عزت وآبرو کا تصور دیا گیا ہے‘ حتیٰ کہ غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت وآبرو کو بھی اتنا ہی محترم قرار دیا گیا ہے جتنا کہ مسلمانوں کی۔ان کی حفاظت کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔پھر یہ کہ خلیفہ یا امیر بھی ماورائے عدالت نہیں۔کوئی بھی شخص خلیفہ کے خلاف مقدمہ دائر کرے تو وہ عام آدمی کی حیثیت سے حاضر ہونے کا پابند ہے۔اسلام سے

قبل تو اس کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ لوگ صرف بادشاہت کے نظام سے واقف تھے جہاں سارے حقوق شاہی خاندان کو حاصل ہوتے تھے اور عوام کو کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ بادشاہ جو چاہے قانون بنائے' بلکہ بادشاہ کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو قانون کا درجہ حاصل ہوتا۔ اگر وہ اچھے موڈ میں ہو تو کسی کو لاکھوں میں تول دے اور اگر موڈ خراب ہے اور کسی نے ایسی کوئی بات کہہ دی جو اسے ناگوار گزری تو چاہے اسے پھانسی پر لٹکا دے۔ سارے اختیارات بادشاہ سلامت کو حاصل ہوتے تھے اور وہ ماورائے عدالت تھا۔

اسلامی نظام میں ایک عام شہری خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھتا ہے کہ آپ کا یہ کرتا کیسے بنا؟ مال غنیمت سے لوگوں کو جو ایک ایک چادر ملی تھی اس میں آپ جیسے طویل القامت شخص کا کرتا تو نہیں بن سکتا۔ انہیں اس کی وضاحت پیش کرنی پڑی کہ ان کے بیٹے نے اپنی چادر بھی انہیں دے دی تھی اور دو چادروں میں یہ کرتہ بن گیا۔ اسی طرح خلیفۂ چہارم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک یہودی نے ایک زرہ کے معاملے میں مقدمہ دائر کیا۔ حضرت علیؓ عام آدمی کی حیثیت سے قاضی کے سامنے پیش ہوئے اور زرہ کی ملکیت کے حوالے سے دو گواہ بھی پیش کر دیے۔ قاضی نے کہا کہ آپ کے گواہان اسلامی اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔ نہ آپ کے صاحبزادے کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے اور نہ آپ کے غلام کی' لہٰذا مقدمہ خارج کیا جاتا ہے۔ یہودی کو زرہ مل گئی۔ یہودی یہ عدل و انصاف دیکھ کر ایمان لے آیا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا دعویٰ غلط تھا لیکن اسلامی نظام میں عدل و انصاف کی بالادستی نے اسے ایمان لانے پر مجبور کر دیا۔ گویا رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے عدلِ اجتماعی کا ایسا نظام قائم کیا تھا جو کبھی کسی انسان کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔

آج کل انسانی حقوق کا بڑا چرچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ ترین حقوقِ انسانی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے نوع انسانی کو اس وقت عطا کیے جب لوگ اس اصطلاح سے بھی واقف نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نظام کی برکات کو دیکھ کر چند سال میں کروڑوں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ تاریخ کی اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے گا کہ حضور ﷺ کے وصال کے فوراً بعد ہی اس وقت کی دو سپر پاورز سے مسلمانوں کا تصادم شروع ہو گیا۔ رومن امپائر کے خلاف تو حضور ﷺ

کے حیات میں ہی شروع ہو گیا تھا' لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ آپ ﷺ نے اس کے بعد جیش اسامہ تیار کر رکھا تھا کہ آپ ﷺ کی رحلت ہو گئی — آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کی کیسی تربیت کی تھی کہ جب اسامہ رضی اللہ عنہ جیسے نوجوان کو کمانڈر بنا دیا گیا جب کہ کبار صحابہؓ موجود تھے اور اس پر اعتراض ہوا تو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کے ترتیب دیے ہوئے جیش کو نہیں روک سکتا —— جب مسلمان دونوں سپر پاورز سے ٹکرا رہے تھے تو ان کی تعداد بمشکل لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہو گی' جبکہ ان دونوں سپر پاورز کے پاس لاکھوں کی تعداد میں باقاعدہ فوج موجود تھی۔ اس وقت ساری توجہ قتال کی طرف مرتکز تھی' لیکن اس کے نتیجے میں جو جو علاقہ فتح ہوتا تھا وہاں ملوکیت ختم اور اللہ کا دین قائم ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی علاقے میں اگر ایک شخص بھی مسلمان نہ ہوا ہو' وہاں بھی صحابہ کرامؓ نے وہ نظام قائم کر کے دکھا دیا' لیکن کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا۔ البتہ معاشرے میں وہ چیزیں جو اسلام میں ممنوع ہیں' ان کی اجازت نہ تھی۔ غیر مسلم اپنے گھر کے اندر شراب پی سکتا ہے لیکن یہ بازار میں فروخت نہیں ہو گی۔ اپنے عبادت خانے میں اپنے طرز کی عبادت کر سکتا ہے' لیکن انہیں زنا کے لائسنس جاری نہیں ہوں گے۔ اگر وہ اس کا ارتکاب کرے گا تو اس پر بھی حد جاری ہو گی۔ قانون اسلام کا چلے گا' جس طرح ہمارے لوگ امریکہ اور یورپ میں جا کر ان کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ وہاں کی بات تو جانے دیں' آپ اپنے ملک میں جہاں ۹۵ فیصد مسلمان ہیں' غیروں کے قانون کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا المیہ ہے۔ اس آزاد خطے کو حاصل ہوئے ۷۱ سال ہو چکے ہیں' آج بھی انگریزوں کے ۱۸۹۳ء کے بنائے ہوئے قوانین اور برٹش ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت پورا حکومتی نظام چل رہا ہے۔ پھر آج ہم شکوہ کرتے پھرتے ہیں ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اس نظام کی پیروی کرتے ہوئے نومسلموں نے اپنی زبان کو چھوڑ کر محمد عربی ﷺ کی زبان کو اختیار کر لیا تھا۔ ان لوگوں پر یہ حقیقت کھلی تھی کہ آپ ﷺ واقعی رحمۃ للعالمین ہیں۔ ان کے دل نے یہ گواہی دی تھی اور تب وہ ایمان لائے تھے۔ اور یا مقبول جان صاحب نے ایک کالم میں لکھا تھا کہ کبھی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مفتوح قوم اپنی زبان چھوڑ کر فاتح قوم کی

زبان اختیار کرتی ہو۔ انسانی تاریخ میں یہ صرف اس وقت ہوا تھا جب صحابہ کرامؓ نے افریقہ‘ شام‘ عراق اور ایران جیسے علاقے فتح کیے تھے۔

اہلِ پاکستان کی اللہ سے بغاوت

اللہ تعالیٰ نے یہ خطہ پاکستان ہمیں معجزانہ طور پر عطا کیا تھا۔ انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں کے مخالف تھے اور زمینی حقائق کے مطابق پاکستان کے بننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی کتاب ’’استحکامِ پاکستان‘‘ میں ایک باب بعنوان ’’پاکستان کا معجزانہ قیام‘‘ میں دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا جسے سب تسلیم کرتے ہیں‘ سوائے ان کے جو سورج کو دیکھنے کے باوجود کہیں کہ اس وقت دن نہیں رات ہے۔ لیکن جب یہ خطہ ہمیں عطا کر دیا گیا جہاں حکومت‘ اختیار اور ملک سب مسلمانوں کا ہے—— یہاں اسلام کی راہ میں کوئی غیر مسلم رکاوٹ نہیں‘ لیکن اس کے باوجود آج بھی یہاں اللہ کا دین غالب نہیں ہے‘ سوائے اس کے کہ کاغذ میں لکھا ہوا ہے جس کو ہم آئین کہتے ہیں۔ اس میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہاں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی‘ لیکن اس پر عملدرآمد کے حوالے سے مکمل خاموشی ہے۔ اس آئین میں جسے آسمانی صحیفے کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے‘ غیر اسلامی شقیں بھی موجود ہیں۔ سارا نظام وہی چل رہا ہے جس کا ذکر ماقبل کیا گیا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ یہ نظام گل سڑ چکا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شہباز شریف یہ بات عوامی جلسوں میں کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پورے نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ انقلابی اشعار بھی پڑھا کرتے تھے‘ لیکن اس گلے سڑے نظام کو ختم کر کے اللہ کا نظام جو واقعی دین حق ہے‘ کو قائم کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسی نظام کے تحت وہ آج قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔

ہمیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ ہم اللہ کے نزدیک کتنے بڑے مجرم ہیں۔ ہم دین کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس پورا دین موجود ہے جو چودہ سو سال پہلے قائم ہو چکا ہے اور جس کی برکات کا مشاہدہ دنیا نے کیا ہے‘ اس کے ہوتے ہوئے غیر اللہ کے قانون کو برقرار رکھنا کیا اللہ سے بغاوت نہیں؟ ہم مانتے ہیں کہ پروردگار نے ہمیں مکمل دین عطا کر دیا ہے جس سے بہتر عادلانہ نظام ہو ہی نہیں سکتا لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہمیں یہ نہیں چاہیے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہم نے انگریزوں کے دیے ہوئے اس نظام کو جس میں جبر و استحصال ہے‘ جسے ایک محکوم قوم کے لیے بنایا گیا تھا‘ اپنے سینے سے لگایا ہوا ہے‘ کیونکہ ہمیں وہی عزیز ہے۔ آج بھی اسٹاف کالج میں بیوروکریٹس کی تربیت ان خطوط پر کی جاتی ہے جو انگریز چھوڑ کر گیا تھا۔ انگریز حاکم تھا اور بیوروکریٹس اس کے دست و بازو تھے اور عوام محکوم تھے۔ پورا نظام حاکم و محکوم کی تفریق کے حوالے سے بنا تھا۔ آج بھی اسی طرز پر تربیت دی جاتی ہے جس میں سکھایا جاتا ہے کہ عوام کو زیادہ لفٹ نہ کراؤ‘ انہیں منہ نہ لگاؤ کہ یہ تو کیڑے مکوڑے ہیں۔

اب دیکھئے کہ کیا ہمیں اللہ کا عطا کردہ نظام پسند ہے؟ ہم نے اپنی روش کے ذریعے کھل کر اعلان کر رکھا ہے کہ ہمیں اللہ کا نظام نہیں چاہیے۔ قرآن وحدیث میں سود کے بارے میں سخت ترین الفاظ ہیں۔ قرآن نے تو واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ اگر تم سودی لین دین نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب ہم سودی نظام کو جاری رکھتے ہیں تو یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمتیں ہمیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار ہیں‘ لیکن ہم نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ہمیں یہ نہیں چاہیے۔ اس کا اظہار علامہ اقبال نے اس طرح کیا ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں‘ کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہ روِ منزل ہی نہیں!

اس نظام کا مماثل کوئی نہیں!

ایک بات اور عرض کروں گا کہ اس دین حق کے مقابلے میں کوئی اعلیٰ ترین عادلانہ نظام دنیا کی کوئی ہستی نہیں دے سکتی‘ اس لیے کہ جب بھی کوئی طبقہ نظام بنائے گا اپنے مفادات کو پیش نظر رکھے گا۔ اگر مرد کوئی نظام بنائے گا تو اس میں وہ عورت کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اسے مرد کی حیثیت سے مردوں کے مفاد کو پیش نظر رکھنا ہے۔ عورت اگر نظام بنائے گی تو وہ اسے اپنے زاویۂ نظر سے بنائے گی‘ وہ مَردوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی۔ سرمایہ دار اگر نظام بنائے گا تو سرمایہ داروں کے مفاد کو سامنے رکھے گا‘ جیسا کہ یہ نظام ساری دنیا میں رائج ہے جو

مکمل طور پر سرمائے کو تحفظ دیتا ہے۔اس کے نتیجے میں نوع انسانی حیوانی سطح پر گر جاتی ہے۔ لوگ بڑی تیزی سے غربت کے نشان سے نیچے جا رہے ہیں‘ لیکن سرمایہ دار ساری دولت اور دیگر وسائل پر قابض ہے۔حاصل یہ کہ جو طبقہ نظام بنائے گا وہ اپنے طبقے کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر بنائے گا۔تمام طبقوں کے ساتھ کوئی طبقہ انصاف کر ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر مزدور بھی نظام بنائے گا تو وہ بھی انصاف نہیں کر پائے گا۔اس کا ذکر علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہ کن میں وہی حیلے ہیں پرویزی!

یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ اگر زمام کار مزدور کے ہاتھوں میں آ جائے تو وہ انصاف کرے گا۔ جو نظام وہ لائے گا وہ بھی استحصال پر مبنی ہوگا۔

کائنات میں ایک ہی ہستی ہے جو تمام انسانوں کے لیے عادلانہ نظام حقیقی معنوں میں دے سکتی ہے اور وہ اللہ عزوجل کی ذات ہے جس نے وہ کامل نظام محمد عربی ﷺ کے ذریعے عطا کر دیا ہے جسے ہم نے مسترد کر رکھا ہے۔روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دجالی دور بھی آئے گا۔مسلمانوں کے ساتھ ان کے جرائم کی وجہ سے وہ سب کچھ ہوگا جو واقعتاً آج ہو رہا ہے۔ان پر عذاب کے کوڑے برسیں گے‘ ذلّت و مسکنت کا عذاب اس قوم پر بھی مسلّط ہوگا‘ لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بشارتیں بھی موجود ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین قائم و غالب ہو کر رہے گا۔اللہ اپنے وفاداروں کی مدد کرے گا خواہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہوئے بالآخر اللہ کے دین کو قائم کر کے رہیں گے اور تب جا کر مقصدِ بعثتِ محمدی ﷺ کی تکمیل ہوگی۔

اس نظام کے حوالے سے دوسری اہم بات اس نظام کی سب سے بڑی برکت ہے کہ یہ ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں خیر کے جذبات کو ترقی ملتی ہے اور انسان کے حیوانی جذبات کو کنٹرول کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اخروی کامیابی کا راستہ ہموار ہو جائے۔اس نظام میں انسانوں کے لیے اصل رحمت یہ ہے۔دنیا میں ہر سطح پر استحصال ختم ہو‘ سب کو انصاف مہیا ہو اور ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جہاں انسان کی انسانی اور ملکوتی قوت ترقی کرے اور جس امتحان میں

اللہ نے اسے ڈالا ہے اس میں وہ کامیاب ہو۔دوسری طرف انسانوں کے بنائے ہوئے نظام کا نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا ابلیس کے لشکر کا حصہ بنی ہوئی ہے‘ بشمول مسلم امہ کے‘ اِلا ماشاء اللہ! انسان کے لیے اس کی عاقبت کے حوالے سے سب سے زیادہ مہلک آج کا نظام ہے۔ کاش ہماری آنکھیں کھل جائیں اور ہمیں نظر آئے کہ جو کچھ ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل کر رہے ہیں‘ کیا اس سے ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احترام کے تقاضے پورے کر رہے ہیں یا اپنے عمل سے خدانخواستہ ان کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!

مسلمانوں کی ذلت و خواری کا ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ ہمارے دشمن وہ سلوک کر رہے ہیں جس سے مسلمانوں کے دل چھلنی ہو جاتے ہیں۔محبوب ربّ العالمین ﷺ جو مسلمانوں کے لیے سب سے محبوب ہستی ہیں‘ ان کے توہین آمیز خاکے بنا کر مسلمانوں کے دل جلا رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طرح نہ قرآن کے مرتبے کو گھٹا سکتے ہیں اور نہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے۔ یہ ساری حرکتیں ہماری دلآزاری کے لیے کی جا رہی ہیں کہ تمہاری مقدس ترین ہستی کے ساتھ ہم یہ کر رہے ہیں۔تمہارا خدا بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے اور وہ بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ ذلت و رسوائی ہماری ہے۔اس وقت دنیا میں پونے دو ارب مسلمان ہیں‘ لیکن کیا ان کی حرکتوں کے خلاف کوئی ایک قدم بھی اٹھایا جا سکا ہے؟ ملعون سلمان رشدی آج بھی دنیا میں دندناتا پھر رہا ہے۔دنیا بھر کے مسلمان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔تو یہ اس امت کی ذلت و رسوائی ہے۔

ایک وقت وہ بھی تھا جب ایک خاتون کی عزت دیبل کی بندرگاہ پر پامال کی گئی تھی تو اس خاتون نے دہائی دی تھی کہ خلیفہ کہاں ہے؟ جب اس کی آواز دربارِ خلافت تک پہنچی تو محمد بن قاسم کو ایک لشکر کے ساتھ بھیجا گیا اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔ پوری دنیا کو پیغام مل گیا کہ کسی مسلمان کو میلی آنکھ سے دیکھنا بھی ممکن نہیں۔اُس وقت مسلمان دنیا میں اس پوزیشن پر تھے۔آج ہم صرف مظاہرے کرتے ہیں اور نعرے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اگلے واقعہ کا انتظار کرتے ہیں۔

فضائے بدر پیدا کر.....

آخر میں‘ میں افغان طالبان کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لفظ ’’طالبان‘‘ کو عالمی سطح پر بہت بدنام کیا گیا ہے‘ لیکن حقیقی طالبان تو وہ تھے جنہوں نے افغانستان میں شریعت نافذ کی تھی۔ وہ واقعی مدرسے کے طالبان تھے۔ یہ لیبل شر پسند عناصر کو ایک منصوبہ بندی کے تحت الاٹ کر دیا گیا اور انہوں نے بھی اسے اپنا لیبل بنالیا۔ پوری دنیا افغان طالبان پر چڑھ کر آ گئی تھی۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ یہ چند دنوں کی مار ہیں‘ لیکن طالبان نے گردن نہیں جھکائی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب بڑا ہے‘ امریکہ نہیں۔ آج امریکی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ انہیں افغان مشن میں ناکامی ہوئی ہے۔ ان کی یہ ناکامی نہتے طالبان کے ہاتھوں ہوئی ہے جن کے بارے میں کہنے والوں نے یہ کہا تھا کہ ان کے لیے ایک امریکی ایف سولہ کافی ہے۔ انسانی تاریخ میں آج تک کفر کی اتنی بڑی قوت جمع نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی اتنے اسلحے استعمال کیے گئے تھے۔ ذرائع ابلاغ اور جاسوسی کے آلات اتنے لائے گئے تھے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ امریکہ اور نیٹو کو شکست ہوئی ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ اب علامہ اقبال کے اشعار سمجھ میں آتے ہیں ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اور ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

اختتام پر میں ’’جوابِ شکوہ‘‘ کا آخری بند آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ علامہ اللہ کی جانب سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

عقل ہے تیری سپر‘ عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ما سوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا‘ لوح و قلم تیرے ہیں!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین کا صحیح شعور عطا فرمائے اور محسن انسانیت‘ رحمۃ للعالمین ﷺ کی رحمت کے عظیم ترین مظاہر سے بھرپور طور پر استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق اور سچ کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

اب فٹ بال کی حرکت اس کک لگانے والے کے کنٹرول میں نہیں رہی۔ وہ اسے روکنا بھی چاہے تو روک نہیں سکتا۔ اب تو اس کی رفتار زمین کی رگڑ (friction) سے کم ہوگی یا راستے میں کوئی رکاوٹ اس کو روک لے گی‘ ورنہ اس کا اپنا زورِ حرکت (momentum) ختم ہوگا تو کہیں جا کر رُکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں دنیا کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ کے ایسے گمراہ کن نظریات رہے ہیں۔ بہرحال انسان جب اپنے بنائے ہوئے پیمانوں پر اللہ کو ناپنا اور تولنا چاہتا ہے تو اسے ایسے ہی حماقت آمیز خیالات و نظریات سوجھتے ہیں۔

آیت ۷۲ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝۷۲﴾ ’’اور ہم نے ان میں اپنے خبردار کرنے والے بھیجے تھے۔‘‘

آیت ۷۳ ﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۷۳﴾ ’’تو دیکھ لو! کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جنہیں خبردار کر دیا گیا تھا۔‘‘

اس حوالے سے قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ‘ قومِ شعیبؑ‘ قومِ لوطؑ اور آلِ فرعون کے عبرتناک انجام کی تفصیلات قرآن میں جا بجا بیان فرمائی گئی ہیں۔

آیت ۷۴ ﴿اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۷۴﴾ ’’سوائے اللہ کے خاص بندوں کے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی ہر زمانے میں ہر جگہ پر مدد کی اور انہیں اس انجامِ بد سے بچا لیا جس سے اللہ کے نافرمان لوگ دوچار ہوئے۔

❁❁❁

ختمِ نبوّت کے تکمیلی مظاہر

اور ہماری ذمّہ داریاں

شجاع الدین شیخ☆

آج کے درسِ قرآن کا موضوع ''ختمِ نبوّت کے تکمیلی مظاہر اور ہماری ذمہ داریاں'' ہے۔ الیکشن کمیشن میں بحیثیتِ امیدوار جو کاغذاتِ نامزدگی داخل کیے جاتے ہیں' ان میں سابقہ حکومت کے آخری دنوں میں ختم نبوت کے حوالے سے ایک حلف نامے کو اقرار نامے میں تبدیل کیا گیا تھا' جس کے خلاف سیاسی جماعتوں اور علمائے کرام نے آواز بلند کی تو حکومت نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اس کی درستی کا اعلان کیا۔ البتہ دال میں کچھ کالا ابھی بھی موجود ہے' جس کی طرف بعض حضرات نے توجہ دلائی ہے۔ لیکن آج ہماری گفتگو اس مسئلہ سے متعلق نہیں ہے' بلکہ ختم نبوت کے تکمیلی مظاہر اور پھر اس ضمن میں اُمت مسلمہ کی ذمہ داریوں کے حوالے سے بات ہوگی۔

ختمِ نبوّت کا قانونی پہلو

ختم نبوت کا ایک پہلو تو قانونی ہے' جو عقیدے کا مسئلہ ہے۔ اس کی طرف میں فقط اشارہ کروں گا۔ ایک ختم نبوت کی تکمیلی شان ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت تکمیل کو پہنچی۔ وہ سلسلہ جو سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوا وہ درجہ بدرجہ ہوتے ہوئے محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر آ کر مکمل ہوا۔ اس مکمل ہونے کا مفہوم کیا ہے' اس کی تکمیلی شان کیا ہے' اس کے مظاہر کیا ہیں اور اس ضمن میں اُمت مسلمہ کی کیا ذمہ داری بنتی ہے' اس حوالے سے آپ کے سامنے کچھ گزارشات رکھنا چاہوں گا۔

حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو خاتم الانبیاء ماننا ہمارے عقیدے کا جزوِ لازم ہے اور

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم وتربیت' تنظیم اسلامی

آپ ﷺ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئے گا' اس کو تسلیم کرنا اس عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس کا قانونی پہلو یہ ہے کہ وہ شخص اللہ کی نگاہ میں مسلمان ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری رسول مانے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾ ''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے یہود اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے نصاریٰ تھے' مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ ایمان والے نہیں ہیں کیونکہ وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

جہاں تک منافقین کا تعلق ہے' تو وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا زبان سے اقرار کرتے تھے' لیکن قرآن کے بیان کے مطابق ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ چنانچہ ان کا قانونی ایمان تو دنیا میں مانا گیا' لیکن آخرت کے اعتبار سے وہ ناکام ہوں گے اور جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے' اس لیے کہ وہ دل سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ یہ اس معاملے کا قانونی پہلو ہے۔

قانونی اعتبار سے مسلمان وہ ہے جو حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی مانے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے ایمان کی قانونی تعریف یوں بیان کی ہے کہ ہر وہ بات جس کی خبر رسول کریم ﷺ نے بیان فرمائی اس کی تصدیق کرنا قانونی ایمان کہلاتا ہے۔ اب صاحبِ ایمان صرف وہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہر خبر کی تصدیق کرے اور اس طرح اس کا ایمان معتبر ہوگا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو مجھے مانے بغیر ان کے لیے کوئی چارہ نہ تھا''۔ حدیث سے یہ بات واضح ہے اور قرآن میں بھی اس کے اشارے موجود ہیں کہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائیں گے۔ تکنیکی اعتبار سے کہا جائے گا کہ اب وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت کے حامل ہوں گے' البتہ ان کے نزول کی وجوہات اور حکمتیں اور بھی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ مسلمان امام کی اقتداء میں نماز بھی ادا کریں گے۔

ختم نبوت کا معاملہ تکنیکی اعتبار سے بہت حساس ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے تو یہاں تک فرمایا کہ بالفرض کوئی تمہارے پاس نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور تم اس سے پوچھو کہ تمہارے پاس

اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ تو تمہارا ایمان جط ہو جائے گا۔ اس سے دلیل طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کوئی دلیل پیش کرے گا تو تم اسے مان لو گے‘ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان نہیں۔

قادیانیوں کے دو گروپ ہیں: ایک احمدی گروپ اور دوسرا لاہوری گروپ۔ جہاں تک ان کے عقائد و نظریات کا تعلق ہے یہ بحث مملکت خداداد پاکستان میں ستمبر ۱۹۷۴ء میں بہت عمدگی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ غلام احمد قادیانی علیہ ماعلیہ (یہ مہذّب انداز ہے کسی پر لعنت بھیجنے کا ‘یعنی اس پر ہو جو کچھ کہ ہو) جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا‘ اس کے پیروکاروں کے پورے گروہ کو عدالتی اور پارلیمانی کارروائی اور آئینی تشریحات کے ذریعے کافر قرار دیا گیا۔ اس کے پیچھے پوری قوم کی محنت تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں یہ کام ہوا۔ اگر کوئی پوری کارروائی کو پڑھنا چاہے تو مولانا اللہ وسایا صاحب نے اسے مرتّب (compile) کیا ہے۔ تحفظ ختم نبوت کے حوالے سے جو کام ہمارے علماء کر رہے ہیں اس کی تفصیلات www.khatmenabuwat.com نامی ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

اس فیصلے کی اس قدر اہمیت ہے کہ ایک مرتبہ ساؤتھ افریقہ کی عدالت کے ایک غیر مسلم جج کے سامنے ایک مقدمہ میں‘ جس کی پیروی کے لیے پاکستان کے چند علماء بھی تشریف لے گئے تھے‘ ۱۹۷۴ء کے مندرجہ بالا فیصلے کو پیش کیا گیا تو اس نے یہ فیصلہ دیا کہ قادیانی جو ختم نبوت کے بعد کسی نبی کو ماننے والے ہیں‘ اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسلام سے خارج ہیں۔ الحمد للہ‘ پاکستان میں یہ کام بہت اعلیٰ سطح پر ہوا۔ یہ الگ بحث ہے کہ غلام احمد قادیانی انگریز کا پروردہ تھا اور آج بھی اس گروہ کو بیرونی دنیا سے بہت فنڈز ملتے ہیں۔ ہماری فوج‘ میڈیا اور مالیاتی اداروں کے اہم عہدوں پر اب بھی قادیانی فائز ہیں۔ اس قانونی حیثیت سے تو ہمیں بہت حساس ہونا چاہیے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے علماء نے اس ایشو پر بہت محنت کی ہے۔ حتیٰ کہ جب تحفظ ختم نبوت کے حوالے سے تحریک چلی تو اس سلسلے میں عوام نے سڑکوں پر جانیں بھی دی ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ اس طرح عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ ہوتا رہا ہے۔ یہ چونکہ عقیدے کا معاملہ ہے‘ لہٰذا اس بارے میں حساسیت سب میں موجود ہے‘ خواہ علماء ہوں‘ سیاسی جماعتیں ہوں یا عوام۔

’’ختم‘‘ کا مفہوم

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ گو یہ ایک علمی پہلو ہے‘ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمارے سامنے اس کے عملی مظاہر بھی آئیں گے۔ تکمیلی مظاہر میں علمی اور تکمیلی دونوں مظاہر ہیں۔ اس کے بعد امت مسلمہ کی کیا ذمہ داری بنتی ہے اس پر ہمارے ہاں بات نہیں ہوتی۔ اس عقیدے اور قانونی معاملے پر جو بہت اہم ہے‘ خوب بات ہوئی ہے اور ہونی بھی چاہیے‘ لیکن اس کے عملی تقاضوں پر صرف ایک فیصد بات ہوتی ہے‘ ۹۹ فیصد نہیں ہوتی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم ’’ختم‘‘ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۴۰ بنیادی اہمیت کی حامل ہے: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾ ’’محمد (ﷺ) تم مَردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں‘ لیکن آپؐ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں‘‘ —— یہ جو فرمایا کہ مَردوں میں سے کسی کے والد نہیں‘ اس کی پشت پر منہ بولے بیٹے کے حوالے سے ایک تفصیلی مسئلہ بھی ہے۔ حضرت زید بن حارث ؓ‘ جو زید بن محمد ﷺ کے نام سے مشہور ہو گئے تھے‘ جب وضاحت آئی تو وہ زید بن حارث ہی کہلائے۔ وہ بھی ایک پہلو ہے۔ مزید برآں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹے عطا فرمائے جن کا کم سنی میں ہی انتقال ہو گیا۔ چنانچہ اب آپ ﷺ مَردوں میں سے کسی کے والد نہیں۔ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور انبیاءؑ کے خاتم ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ختم کا کیا مفہوم ہے۔ ختم کے دو مفہوم ہیں اور دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ ہم اردو میں کہتے ہیں کہ میرے پاس سو روپے تھے‘ ختم ہو گئے۔ گویا ایک شے پہلے موجود تھی‘ اب وہ ختم ہو گئی۔ اس اعتبار سے ختم نبوت کا مفہوم یہ ہو گا کہ نبوت کا جو سلسلہ سیدنا آدم علیہ السلام سے جاری تھا وہ سیدنا محمد ﷺ پر ختم ہو گیا۔

ضمناً ایک بات یہ کہ غلام احمد قادیانی آنجہانی نے منطقی دلائل دینے کی کوشش کی جو یقیناً بھونڈے تھے۔ اس نے کہا کہ نبوت تو اللہ کی رحمت ہے‘ یہ رک کیسے سکتی ہے؟ رحمت کو تو جاری رہنا چاہیے۔ اس کے جوابات آگے آئیں گے کہ کیوں محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد منطقی طور پر بھی کسی رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا صدیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس بدبخت کو رحمت بنا کر

بھیجنا تھا؟ معاذ اللہ! اس کی توجیہہ کے مطابق کیا ان صدیوں کے دوران رحمت کی ضرورت نہیں تھی؟ اس قسم کے بھونڈے دلائل کے علماء نے جواب دے کر اس باب کو بند کر دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ عقائد اور دین کی اصولی تعلیمات کے معاملات میں اہلِ علم سے جڑے رہیں۔ وہاں چودہ صدیوں کی میراث ہے۔ ہمیں بظاہر لگتا ہے کہ یہ نئے سوالات ہیں' درحقیقت وہ سوالات صدیوں پرانے ہیں اور ان کے جوابات ہمیں اپنے علمی ورثے میں دلائل کے ساتھ میسر آ جائیں گے۔

ختم کا ایک اور مفہوم ہم اردو میں استعمال کرتے ہیں' مثلاً ایک عمارت کی تعمیر شروع ہوئی تھی جو اختتام پذیر ہوگئی۔ یہاں ختم کا مفہوم کچھ اور ہے۔ یہاں ختم کا مفہوم تکمیل کے معنیٰ میں ہے کہ نبوت کا جو سلسلہ سیدنا آدم علیہ السلام سے چلا آ رہا تھا وہ اب حضور ﷺ پر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

ختمِ نبوّت کے تکمیلی مظاہر

اس تکمیل تک پہنچنے میں تدریج ہے اور پھر اس تکمیل کے مظاہر ہیں' جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ وہ پانچ باتیں ہیں۔ یہ خاصیت صرف حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے جو اب بیان کی جا رہی ہے۔ یہ ختم نبوت کے علمی اعتبار سے بھی تکمیلی مظاہر ہیں اور عملی پہلو سے بھی۔

(۱) حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت عالمگیر ہے اور آپؐ سے پہلے کبھی کسی رسول کے لیے ایسا معاملہ نہ ہوا۔

(۲) محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو قرآن عطا ہوا' جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی۔ پچھلی کسی کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے نہیں لی۔

(۳) محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر دین کے مکمل کر دیے جانے کا اعلان ہوا۔ تکمیل دین کا یہ اعلان محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے پہلے کسی رسول پر نہ ہوا۔

(۴) محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا پیغام صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ بالفعل اس کے تقاضوں کو عملاً انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر ایک نظام کے طور پر پیش کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ سے قبل کبھی ایسا نہ ہوا کہ انبیاء و رسل علیہم السلام جو دین لے کر آ رہے تھے' وہ بالفعل قائم اور نافذ بھی ہوا ہو' بلکہ ایسا بھی ہوا کہ قوموں کو مٹا ڈالا گیا جب وہ رسولوں کی جان کے درپے ہوگئیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر بلا لیا' کیونکہ لوگ ان کی جان کے

درپے ہو گئے تھے۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم اور نافذ کرنے کی ساری جدوجہد خالص انسانی سطح پر ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں اصل معجزہ قرآن ہے۔ دیگر معجزات بھی ہیں مگر دینِ الٰہی کے نفاذ کی ساری جدوجہد انسانی سطح پر ہوئی ہے اور اس کے دوران آپ ﷺ کا مقدس لہو بہا ہے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھوک برداشت کی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جانیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ سارا کام خالصتاً انسانی سطح پر ہوا ہے' البتہ اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی آئی ہے۔

یہ تو تھیں عملی مظاہر کی باتیں۔ اس میں کچھ اطمینانِ قلب والی بات بھی آ جائے گی کہ ہم سب رسول اللہ ﷺ کے ختم نبوت پر ایمان تو رکھتے ہیں' البتہ ان پانچوں باتوں کے دلائل بھی اگر ہمارے سامنے آ جائیں تو اس سے ہمارے ایمان میں قدرے گہرائی اور دل میں اطمینان کا معاملہ ہو جائے گا۔ یہ بات عجیب لگتی ہے کہ کچھ منطقی دلائل کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے' لیکن اس ضمن میں قرآن مجید کے ایک مقام سے حوالہ کے علاوہ دو بزرگوں کی کتابوں کا ذکر بھی کر دوں تو آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے اسلاف نے یہ کام بھی کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ ربّ العزت کے ساتھ مکالمہ ہوا جس کا تذکرہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۰ میں ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی کہ اے رب مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردوں کو زندگی دے گا؟ اللہ نے فرمایا کہ کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ کیوں نہیں! (تیری قدرتِ کاملہ پر یقین کامل رکھتا ہوں) لیکن ذرا دل کا اطمینان مطلوب ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چار پرندے لے لو' انہیں اپنے سے مانوس کر لو' اس کے بعد انہیں ذبح کرو اور ان چاروں کے گوشت کا مکسچر بناؤ اور اس کے چار حصے کر کے انہیں چار مختلف پہاڑیوں پر رکھو۔ پھر انہیں بلاؤ' یہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے۔ اسی بات کا حوالہ دے کر امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے اپنی معروف کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں شریعت کے اسرار و رموز یعنی اللہ کے احکامات میں موجود hidden wisdom کو بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''اسلامی احکام: عقل کی روشنی میں'' میں بھی اسلامی احکام کی حکمتیں بیان فرمائی گئی ہیں' لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے ان احکام کو مانو' پھر سوچو' تو تمہیں ان کی حکمتیں بھی ملیں گی۔ اب جو

لوگ ختم نبوت کے مندرجہ بالا پانچ تکمیلی مظاہر کو مانتے اور سمجھتے ہیں تو ذیل میں ان کے اطمینانِ قلب کے لیے فرداً فرداً ہر مظہر کے دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔

۱) رسول اللہ ﷺ کی عالمگیر رسالت

ختم نبوت کا پہلا تکمیلی مظہر یہ ہے کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت عالمگیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام مختلف خطوں اور ان میں بسنے والی اقوام کے لیے آتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان سب نے ایک ہی ندا لگائی کہ ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ .....﴾ ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو''۔ تاریخی طور پر یہ ثابت شدہ بات ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف خطوں میں مختلف پیغمبر بھیجے گئے۔ اس وقت ان خطوں کے آپس میں رابطے ناممکنات میں سے تھے' کیونکہ اس وقت ذرائع مواصلات اتنے نہیں تھے کہ آخری عالمگیر پیغام دے دیا جائے کہ جس کا ہر علاقے میں پہنچنا ممکن ہو۔ بنی اسرائیل نے ایک دن میں ۴۳ انبیاء کو شہید کیا ہے۔ اتنی کثرت سے ایک وقت میں اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو ان کی ندا ''یا بنی اسرائیل'' تھی۔ انہوں نے بھی ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ'' (اے لوگو!) نہیں فرمایا۔ لیکن جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے یٰٓاَیُّهَا النَّاس سے لوگوں کو مخاطب کیا۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ.....﴾ (آیت ۲۱) ''اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا''۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا: ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ (آیت ۱۵۸) ''(اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیں کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (آیت ۲۸) ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ گویا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت عالمگیر ہے اور آپ ﷺ تمام انسانوں کے لیے آئے' جبکہ پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام مخصوص علاقے' مخصوص قوم اور مخصوص وقت کے لیے آئے۔ سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۱۰۷﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے رحمت بنا کر بھیجا''۔ جب آپ ﷺ کی رسالت عالمگیر ہو گئی تو کسی اور رسول کے آنے کی حاجت نہ رہی۔

رسول اللہ ﷺ کے دور کے بارے میں بڑی دلچسپ بات ہے کہ جدہ کی بندرگاہ آپ ﷺ کے دور میں بھی موجود تھی اور اس کے ساحل پر چین کے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ وہ روایت تو محدثین کے نزدیک درست نہیں کہ ''علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے''' مگر یہ بات حقیقت ہے کہ اس وقت چین موجود تھا۔ اس کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کا دور تو چودہ سو برس پہلے کا ہے۔ جدہ کی بندرگاہ پر روم کے جہاز بھی آ کر لگتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ ۳۵ برس کے تھے تو خانۂ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کا موقع پیش آیا اور اسی وقت حجر اسود کی تنصیب کا معاملہ بھی ہوا تھا۔ اس وقت بڑی تعداد میں لکڑی کی ضرورت تھی۔ جدہ کی بندرگاہ پر روم کا ایک جہاز لنگر انداز تھا' اس میں ایک معمار تھا جس کا نام ''باکون'' تھا' اس کو خانۂ کعبہ کی تعمیر پر لگایا گیا تھا اور لکڑی یہیں سے لی گئی تھی۔ اس وقت دو سپر پاورز ایران اور روم تھے۔ دنیا کے دیگر ممالک کے اس خطے سے روابط تھے لہٰذا اللہ کا پیغام ان ممالک میں پہنچنا ممکن تھا۔

یہ تو تھے منطقی دلائل جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کے عالمگیر ہونے کے حوالے سے زیر گفتگو آئے' لیکن ایک بات ہمارے لیے بہت اہم ہے کہ منطق ہمارے لیے نیچے ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم اوپر ہے۔ اس کی ایک سادہ مثال موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے ضمن میں فقہی تفصیلات تو موجود ہیں' لیکن اتنا سب کو پتا ہے کہ موزوں پر مسح پاؤں کے نیچے سے نہیں بلکہ اوپر سے ہوتا ہے' حالانکہ پیر تو نیچے سے گندے ہوتے ہیں۔ عقل تو کہتی ہے کہ مسح نیچے سے ہونا چاہیے' لیکن نقل یعنی شریعت کے قوانین جو منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں' اس کے مطابق مسح موزوں کے اوپر سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ اصول یہ ہے کہ نقل اوپر اور عقل نیچے ہونی چاہیے۔

۲) قرآن مجید کی حفاظت کا ذِمّہ اللہ عزوجل نے اُٹھایا

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ پچھلی کسی کتاب کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود نہیں لیا' البتہ آخری کتاب قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ سورۃ الحجر میں اس کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ ''بیشک ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے تھے کہ پچھلی کتابوں کو حق تو ہے کہ اللہ سے عرض کریں کہ اے اللہ! تو نے ہمیں بھی

نازل کیا تھا تو ہماری حفاظت کا ذمہ کیوں نہیں لیا؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ان ساری کتابوں کی تعلیمات قرآن میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ آپ نے بار بار مدنی سورتوں میں پڑھا ہوگا کہ قرآن تصدیق کرتا ہے ان باتوں کی جو پچھلی قوموں پر نازل ہوئیں اور قرآن ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ کسی کتاب کے بیسیوں ایڈیشنز چھپ چکے ہوتے ہیں' جبکہ مارکیٹ میں آخری ایڈیشن دستیاب ہوتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں تورات کے ''احکامِ عشرہ'' بھی موجود ہیں۔

البتہ ایک بہت غور طلب سوال ہے کہ قرآن مجید ہی آخری کتاب کیوں؟ اس کا بڑا دلچسپ اور قیمتی جواب ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دوسری ہدایات عطا فرمائیں' جیسے ایک بچے کو شروع میں ہم بنیادی باتیں (basics) پڑھاتے ہیں۔ گریڈ ایک کے بچے کو گریڈ دس کی کتابیں پڑھائیں گے تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ گریڈ دس کے طالب علم کو ماسٹرز کی کتابیں پڑھائیں گے تو وہ بھی پریشان ہو جائے گا۔ چنانچہ جیسے بچوں کا ذہنی ارتقاء ہوتا ہے' اس کا شعور درجہ بدرجہ آگے بڑھتا اور پھر پختہ ہوتا ہے' بالکل اسی طرح انسانیت کا بھی ذہنی ارتقاء ہوا ہے اور وہ بھی درجہ بدرجہ اپنے شعور کی پختگی کو پہنچی ہے۔ اس پر ایک بہت پیاری بات ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بیان فرمائی جو ان کے سامنے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے بیان فرمائی تھی۔ وہ پاکستان میں فلسفے پر ایک اتھارٹی تھے' اگرچہ وہ زیادہ معروف شخصیت نہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا: ڈاکٹر صاحب! میرے سامنے معانی کا ایک خزانہ کھل گیا ہے۔ آج کل آپ کو جتنے فلسفے دکھائی دے رہے ہیں وہ سب کے سب حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل وجود میں آ چکے تھے۔ آج کوئی فلاسفر نئی بات نہیں کہہ رہا' بلکہ سارے پرانے فلسفے چلے آ رہے ہیں۔ بات یہ ہوئی ہے کہ ہزار بارہ سو برس کا ایک عرصہ گزرا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ چھ سو برس پہلے سے لے کر ان کے بعد کے پانچ چھ سو برس بعد تک۔ اسی عرصے میں افلاطون' ارسطو اور دوسرے بڑے بڑے فلسفی گزرے' اس عرصے میں انسان از خود جو کچھ سوچ سکتا تھا' وہ سوچ چکا۔ اب انسان اللہ تعالیٰ کے آخری پیغام کو ہضم کرنے کے قابل ہوا' چنانچہ پھر نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ دنیا میں ۵۷۱ء میں تشریف لائے اور قرآن ۶۱۰ء میں نازل ہونا شروع ہوا۔

فلسفہ کے میدان کے تین بہت بڑے سوالات ہیں: (۱) میں کون ہوں؟ (۲) کیا مجھے کسی نے پیدا کیا ہے اور میرا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ (۳) یہ کائنات کیا ہے' اس کو کس نے اور کیوں بنایا ہے؟ ان ساری باتوں کا جواب ہمیں قرآن حکیم دیتا ہے۔

۳) رسول اللہ ﷺ پر تکمیلِ دین کا اعلان

حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا تیسرا مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ پر دین کی تکمیل کا اعلان ہوا جو آپ ﷺ سے پہلے نہیں ہوا۔ سورۃ المائدۃ میں واضح طور پر اعلان کر دیا گیا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (آیت ۳) ''آج کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل فرما دیا اور اپنی نعمت کا تم پر اتمام کر دیا اور اسلام کو تمہارے لیے دین کے طور پر پسند کر لیا''۔ اس پر بھی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی تحریر ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' میں اور ایک ویڈیو میں بڑی دلچسپ گفتگو فرمائی جس کا عنوان ''عصرِ حاضر میں سیرت النبی ﷺ کی اہم ترین رہنمائی'' ہے۔ اس میں اس سوال کا شافی جواب مل جائے گا کہ آپ ﷺ پر تکمیلِ دین کا اعلان کیوں ہوا۔ آیئے ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جس طرح انسان کا ذہنی ارتقاء ہوتا چلا گیا ہے اسی طرح اس کا معاشرتی ارتقاء بھی ہوتا چلا گیا ہے۔ البتہ اس وقت مجھے نہ ڈارون کی تھیوری پر کچھ گفتگو کرنی ہے اور نہ ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ انسان کا جب معاشرتی سطح پر ارتقاء ہوا' جب وہ اس کی انتہا پر پہنچ گیا تب اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کا اعلان فرمایا۔ اس سے پہلے سادہ زندگی کے حوالے سے سادہ ہدایات آتی رہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی سورۃ البقرہ میں سادہ سا اصول بتا دیا گیا: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''جب جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے' تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کو نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ کسی غم سے دوچار ہوں گے۔''

ہدایت کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور دوسری طرف معاشرتی اعتبار سے انسان ترقی کرتا گیا۔ پہلے بنی نوعِ انسان نے بستیاں بنائی ہوں گی' دریا کے کنارے رہائش اختیار کی ہوگی۔

پھر قبائلی زندگی کا دور بھی گزرا ـــــ قبائل کے مسائل ہمارے علم میں ہیں۔ کسی درجے میں مدنی زندگی میں قبائل کے معاملات آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی کے دور میں بھی نظر آتا ہے۔ اگلا مرحلہ بڑے شہروں کا آتا ہے جس کا انتظام ریاست کرتی ہے اور آج بھی ریاستیں موجود ہیں۔ اس سے اگلے مرحلے پر گلوبل ویلیج کی باتیں ہو رہی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے دور میں بھی دو سپر پاورز روم اور فارس موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو الہدیٰ بنا کر نازل فرمایا۔ تین مرتبہ قرآن کریم میں آیا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹) ''وہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر''۔ گویا پہلے ھُدًی (guidance) آ رہی تھی اور اب اَلْھُدٰی (the guidance) آ گئی۔ اب انسان اپنے سماجی ارتقاء کی منزل کو پہنچا ہے تو تکمیل دین کا اعلان آیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا رکھا گیا ہے۔

زندگی کے بعض گوشے تو ایسے ہیں جن میں کسی ارتقاء کا امکان نہیں۔ صدیوں پہلے بھی مرد اور عورت کے نکاح کے بعد خاندان وجود میں آ جاتا تھا، اس میں کسی ارتقاء کا امکان نہیں۔ چنانچہ سب سے زیادہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرد اور خاندان کے بارے میں عطا فرمائیں، لیکن باقی گوشے مثلاً معیشت، سیاست، عدالت، امورِ سلطنت اور عالمگیر امور کے بارے میں قرآن میں ہدایات کم آئی ہیں، اس لیے کہ اپنے عہد کے مطابق ان امور کے بارے میں نظام کی تشکیل کی جائے گی۔ یہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ہمارے دین کی خوبصورتی ہے کہ جہاں زیادہ ارتقاء کا امکان نہیں وہاں تفصیلی ہدایات دے دی گئیں، لیکن جہاں ارتقاء کے امکانات ہیں وہاں قرآن و حدیث میں اصول عطا کیے گئے اور یہ باور کرایا گیا کہ اگر کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کیا جائے۔

۴) دینِ الٰہی کا بالفعل نفاذ

حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا تیسرا تکمیلی مظہر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف دعوت ہی پیش نہیں کی بلکہ اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر کے بھی دکھایا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام خود

بھی رسول تھے اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام بھی رسول تھے، مگر جب ان کے دور میں اللہ کی راہ میں جنگ کا موقع آیا تو قوم نے یہ کہہ کر اس میں شرکت سے انکار کر دیا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (المائدۃ) ''(اے موسیٰ!) آپ اور آپ کا رب جا کر قتال کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں انقلاب نہیں آیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں تو یہود ان کو واجب القتل قرار دے کر سولی دینے کے درپے ہو گئے تو اللہ نے انہیں اٹھا لیا، سو ان کے دور میں بھی انقلاب نہیں آیا۔ مگر نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے صرف دعوت ہی پیش نہیں کی، بلکہ اس کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا فرمایا جو تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب ہے۔

آج یہ تصور مسلمانوں کے ذہنوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی سنت چند اعمال تک محدود سمجھ لی گئی ہے۔ میٹھے کی سنت لوگوں کو یاد ہے، لیکن نبی ﷺ کے فاقوں، آپ ﷺ کے بہتے خون، نبی ﷺ کے گھر میں دو دو مہینے تک چولہا نہ جلنے کی سنت فراموش کر دی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے ایک دن میں کبھی تین وقت کا کھانا نہیں کھایا۔ ہم پتا نہیں دن میں کتنی کتنی مرتبہ کھاتے ہیں۔ پانچ ہزار کا عمامہ اور دس ہزار کی خوشبو سنت سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ خوشبو لگانا اور عمامہ پہننا مبارک، مگر خوشبو کبھی میدانِ اُحد میں بھی لگانے کی ضرورت پڑ جائے گی، کبھی طائف کی گلیوں میں جا کر عمامہ پہننا پڑ جائے گا، یہ سب تصور بیان میں نہیں آتا۔

اگر اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ کہ یہ دین حق دنیا کے دوسرے نظام ہائے زندگی پر غالب ہو تو اس کے لیے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے انقلابی جدوجہد فرمائی۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ برس نظر کے سامنے رکھیے۔ حضرت سُمیّہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما کی شہادتیں ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاؤں کے نیچے کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔ حالت سجدہ میں آپ ﷺ کے جسم اطہر پر اوجھڑی لا کر ڈالی جاتی ہے۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا اور اس کے بعد ایک نظام برپا ہوا، جس کے بارے میں جی ایچ ویلز، مائیکل ہارٹ اور گاندھی جیسا شخص بھی کہنے پر مجبور ہوا کہ تاریخ میں لوگوں نے اخوت، اتحاد اور مساوات وغیرہ کی باتیں تو بہت کی ہیں، لیکن پہلی مرتبہ اس بنیاد پر اگر کوئی نظام قائم ہوا ہے تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں

ہوا۔ یہ انقلابی شان غیروں کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے۔اس انقلاب کی بتمام وکمال شان ہمیں دورِ فاروقی میں دکھائی دیتی ہے۔

۵)انسانی سطح پر نفاذِ دین کی جِدّوجُہد

رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا پانچواں تکمیلی مظہر جو ہمارے لیے بھی اہم ترین ہے‘ وہ یہ ہے کہ یہ ساری جدوجہد انسانی سطح پر برپا ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے تو بادل کا سایہ بھی کر دیا گیا‘ مَن وسلویٰ بھی اتار دیا گیا‘ پانی کے چشمے بھی جاری کر دیے گئے‘ تب بھی وہ قتال کے موقع پر فرار ہو گئے۔فرعون جیسے شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے مگر وہ ایمان نہ لایا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مُردوں کو زندہ کر دکھایا لیکن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا انقلاب معجزوں سے برپا نہیں ہوا‘ بلکہ حضور ﷺ نے خالص انسانی سطح پر اس کے لیے جدوجہد فرمائی تھی۔آپ ﷺ کے معجزات بہت ہیں‘ مگر یہ جدوجہد خالص انسانی سطح پر ہوئی۔طائف کی گلیوں میں اور اُحد کے میدان میں حضور اکرم ﷺ کا مبارک خون بہا ہے۔اللہ تعالیٰ بچانے پر قادر ہے لیکن اُس نے ایسا ہونے دیا‘ کیونکہ کل اُمتی یہ نہ کہیں کہ یہ تو بہت مشکل مرحلہ ہے۔ساری امت ایک طرف اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ ایک طرف ع ’’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘۔آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی لاشیں اُٹھائی ہیں۔اُحد کے میدان میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی کٹی پھٹی لاش آپؐ کے سامنے لائی گئی‘ جس کی بے حرمتی کی گئی تھی‘ اُن کا کلیجہ نکال کر چبایا گیا تھا۔اس جدوجہد کے دوران تقریباً ۲۵۹ صحابہ شہید ہوئے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت بھی آئی ہے۔غزوۂ بدر میں فرشتوں کے ذریعہ نصرت آئی:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

سورۃ الانفال کی آیت ۱۸ میں اس کی تفصیل آئی ہے۔بدر میں ستر کفار قتل ہوئے اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ یعنی اے مسلمانو! تم نے انہیں قتل نہیں کیا‘ بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔نبی اکرم ﷺ نے مٹی ہاتھ میں لے کر کفار کی طرف پھینکی جو کفار کی آنکھوں میں گئی تو بھگدڑ

مچی اور وہ قتل کیے گئے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ! وہ مٹی آپ نے نہیں پھینکی‘ بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔اس سارے کام کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف کر رہا ہے۔قربِ الٰہی اور روحانیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا مقام ہو سکتا ہے کہ عمل بندہ کر رہا ہو اور اللہ فرما رہا ہے کہ یہ عمل تو نہیں‘ میں کر رہا ہوں۔اگر ہم آج اپنا سب کچھ دین کی خاطر لگانے اور کھپانے کو تیار ہو جائیں تو اللہ کی نصرت یقیناً آئے گی۔

اُمّت کی ذمہ داریاں

مندرجہ بالا ختم نبوت کے پانچ تکمیلی مظاہر ہیں۔اس ضمن میں نوٹ کر لیجیے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو گیا ہے‘ لیکن کارِ رسالت باقی ہے اور یہ ذمہ داری اب ہماری ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کسی علاقے میں جاتے تھے تو کہتے تھے کہ ’’ہم اللہ کے رسول کے رسول ہیں‘‘۔یعنی اللہ نے آپ ﷺ کو بھیجا تھا اور ہمیں آپ ﷺ نے بھیجا ہے۔لوگ جب پوچھتے ہیں کہ مرنے کے بعد عیسائی اور ہندو کہاں جائیں گے؟ تو ہم کہتے ہیں جہنم میں۔جب پوچھا جاتا ہے کہ ہم کہاں جائیں گے؟ تو ہم فوراً کہتے ہیں کہ ہم ان شاء اللہ جنت میں جائیں گے۔لیکن ذرا رک کر سوچیں کہ جن کے بارے میں ہم جہنم کے فتوے دے رہے ہیں‘ اگر قیامت کے دن وہ کہیں کہ اے اللہ! تیرا پیغام تو ہمارے پاس پہنچا ہی نہیں‘ تو اس بارے میں اللہ ہم سے پوچھے گا‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد دنیا کو دین کی دعوت دینا ہمارا فرض ہے۔

اس حوالے سے قوم ایک پیج پر نہیں ہے۔نہ فوج‘ نہ حکمراں‘ نہ اپوزیشن اور نہ ہی سیاسی جماعتیں‘ نہ عوام الناس اور نہ ہی مذہبی طبقات کی اکثریت کہ ان کو تو اپنا اپنا مسلک زیادہ عزیز ہے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر نہ کوئی دین سمجھ سکتا ہے اور نہ دین کا تحفظ کرنے والا ان سے بڑھ کر کوئی ہو سکتا ہے۔حضور ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد کچھ لوگ جھوٹی نبوت کے دعویدار پیدا ہو گئے۔ان کے خلاف صدیق اکبرؓ نے جہاد کیا۔کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو ان کے خلاف یہ کہتے ہوئے جنگ کی کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اگر زکوٰۃ کے اونٹ کے ساتھ رسی بھی دیتے تھے تو انہیں اب بھی وہ دینی ہو گی۔اس پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابھی ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں۔حضرت ابوبکر نے جواب دیا: اے عمرؓ! آپ کو کیا ہو گیا؟ اللہ کی قسم اگر کسی نے ساتھ نہ دیا تو میں تنہا جنگ کروں گا۔اس طرح عقیدے اور

شریعت دونوں کی حفاظت ہوگئی۔ آج عقیدے کی تو الحمدللہ حفاظت کی جارہی ہے‘ مگر شریعت کے لیے کون کھڑا ہوگا؟ شریعت کے لیے آئی ایس پی آر کی کوئی پریس ریلیز آئی ہے؟ کوئی رکن‘ پارلیمنٹ میں شریعت کے لیے کھڑا ہوا ہے؟ کوئی اپوزیشن یا حکمران جماعت شریعت کے نفاذ کی بات کررہی ہے؟ اللہ کی شریعت پامال ہورہی ہے‘ سودی نظام جاری ہے‘ فحاشی اور عریانی کا طوفان جاری ہے‘ کیا دینی جماعتوں میں سے بھی کوئی سڑکوں پر آرہا ہے؟ کیا عوام اس بارے میں سوچتے ہیں؟ سمارٹ فون کی سکرین کے ٹوٹنے کا تو ہمیں افسوس ہوتا ہے‘ اللہ عزوجل کے احکامات ٹوٹ رہے ہیں‘ شریعت مغلوب ہے‘ کیا کسی کو تکلیف ہوتی ہے؟

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پر تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اس پر تو ایک پیج پر آیئے۔ بجلی اور گیس کے لیے تو سڑکوں پر آتے ہیں‘ شریعت کے لیے کوئی سڑک پر آنے کے لیے تیار نہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ’’تم بہترین امت ہو‘ تم لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو‘ تم نیکی کا حکم دو گے اور بدی سے روکو گے‘‘۔ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہوا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ’’کہ دین کو قائم کرو اور اس بارے میں کسی تفرقے میں مبتلا نہ ہو‘‘۔ اسی طرح اللہ ربّ العزت کے تین فتوے سورۃ المائدہ میں وارد ہوئے ہیں:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴﴾
﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵﴾
﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷﴾

کہ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو ظالم ہیں ..... وہی تو کافر ہیں ..... وہی تو فاسق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حوالے سے سنجیدگی عطا فرمائے۔

دو بشارتیں

اب میں دو بشارتیں سنا کر بات کو ختم کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد دعوت کا کام ہمیں

کرنا ہے‘ دین کے غلبے کی جدوجہد ہمیں کرنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا ہے اور ایک تمنّا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے دعا دی کہ:

((نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ)) (رواہ الترمذی و ابن حبّان)

’’اللہ اس بندے کو تروتازہ (خوش وخرم) رکھے جو مجھ سے کوئی بات سنے اور اس کو اسی طرح دوسروں تک پہنچا دے جیسے کہ اس نے سنی ہو۔ اس لیے کہ جن تک بات پہنچائی جاتی ہے ان میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو سننے والے سے زیادہ سمجھنے والے ہوتے ہیں۔‘‘

ہم ماں کی دعا کو جنت کی ہوا قرار دیتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کی دعا کتنی عظیم ہوگی!

دوسری رسول اللہ ﷺ کی تمنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں تشریف فرما تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے کاش میری ملاقات میرے بھائیوں سے ہو‘‘۔ صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ ﷺ کے بھائی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تم تو میرے صحابی ہو۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں جو تمہارے بعد آئیں گے۔ انہیں دو گتّوں کے بیچ قرآن ملے گا جبکہ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ وہ تسلیم کریں گے کہ یہ کتاب محمد ﷺ پر نازل ہوئی‘‘۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’وہ مجھ پر ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو‘ میری تصدیق کریں گے جیسے تم میری تصدیق کرتے ہو اور وہ میری مدد کریں گے جیسے تم میری مدد کرتے ہو۔ اے کاش میری ملاقات ان بھائیوں سے ہوتی‘‘۔ آپ ﷺ تو ہم سے ملنا چاہتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ہم دین کو تھامیں‘ آپ ﷺ کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ختم نبوت کے تکمیلی مظاہر اور اس کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین! ۞ ۞ ۞

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

اُولی الامر (امیر‘ صاحبِ منصب‘ علماء وغیرہ) کو نصیحت کرنے کے آداب

سید عبدالوہاب شیرازی

قرآن حکیم میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اولوالامر کی اطاعت کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اولوالامر لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام وانتظام ہو۔

اولوالامر سے کیا مراد ہے‘ اس میں مفسّرین اور محدّثین کے بے شمار اقوال ہیں‘ جن کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ اولوالامر کا مصداق ہر درجہ کے حاکموں پر ہوتا۔ چنانچہ خلیفۂ وقت جس کو حکومت عامہ حاصل ہے‘ بدرجہ اولیٰ اس لفظ کا مصداق ہے‘ بلکہ جب بھی اولی الامر بولا جائے گا تو اس کے متبادل معنی خلیفہ ہی ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر درجہ کے حاکموں‘ یہاں تک کہ علماء اور فقہاء کے لیے بھی یہ لفظ ایک خاص اعتبار سے بولا جاتا ہے۔

ہم سب انسان ہیں‘ اس لیے انسانوں سے غلطیاں بھی ہوتی رہتی ہیں‘ اور سب کی عقلیں ایک جیسی نہیں ہیں‘ اس لیے اختلافات بھی ہو سکتے ہیں۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے خود کئی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں یا اختلافات کو حل کرتے کرتے تفرقے کا باعث بن جاتے ہیں۔ جب تک مسلمانوں کے سروں پر خلافت کی چھتری قائم تھی‘ اس وقت تک اگرچہ کسی بھی شخص کو دلائل کے ساتھ اختلاف کرنے کی گنجائش تو تھی‘ لیکن کسی کو امیر کی اطاعت سے ہاتھ کھینچنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس معاملے میں اتنی سختی تھی کہ کوئی شخص مسلمانی کا دعویٰ کرے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرے‘ اس کا تصور کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان متحد بھی تھے اور مضبوط بھی۔ جب کوئی امیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کرتا تھا تو وہ ریاست کا باغی شمار ہوتا تھا۔

اب ہمارے سروں پر خلافت کی چھتری موجود نہیں‘ اس لیے اگرچہ ہمارے ہاں دینی جماعتوں اور تنظیموں کی وہ حیثیت تو نہیں کہ کوئی کسی جماعت یا تنظیم کی بیعت یا جماعت کے سربراہ سے وفاداری کا حلف توڑ نہیں سکتا یا جماعت کو چھوڑ نہیں سکتا‘ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اختلاف کرنے یا دینی قائدین کے ادب واحترام کے پیمانے بھی بدل گئے ہیں‘ یا ہم اب اختلاف کرنے یا کسی کو نصیحت کرنے میں سنت رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ واسلاف کے منہج کے پابند نہیں رہے۔ جب ہم نے رسول اللہ ﷺ کا کلمہ پڑھا ہے‘ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی راہوں پر چلنے میں اپنی کامیابی کا یقین بھی ہے اور اسلاف واکابرینِ اُمت پر فخر بھی ہے تو ہمیں اس منہج کو بھی کسی صورت ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ سے ہم تک پہنچا‘ جسے صحابہ کرامؓ نے اختیار کیا اور ہمارے اسلافؒ جس کی تبلیغ کرتے رہے۔

ہماری یہ بہت بڑی بدقسمتی اور افسوس کا مقام ہے کہ ہماری مروجہ سیاسی جماعتوں میں ایک دوسرے پر الزامات‘ بہتان تراشی اور دوسروں کو رسوا کرنے کا جو سلسلہ پہلے کم پیمانے پر ہوتا تھا‘ اب کچھ نئی جماعتوں کے ورود اور سوشل میڈیا تک ہر بندے کی رسائی کے بعد یہ سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ بات نہ صرف مشاہدے بلکہ عملی تجربے میں بھی آئی ہے کہ ’’فیس بک‘‘ پر انتہائی خاموش طبع انسان بھی کچھ نہ کچھ غیر مناسب پوسٹ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غلط زبان اور مخالفین کو ذلیل کرنے کی روش جو پہلے صرف مروجہ سیاسی جماعتوں میں پائی جاتی تھی‘ اب وہ مذہبی اور دینی جماعتوں اور ان کے کارکنوں میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ فیس بک پر ہر وقت ایک جنگ کا سماں ہوتا ہے۔ نہ کسی کی عزت محفوظ رہتی ہے اور نہ کسی کا مقام۔ پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور خاص اختلافات کو ہر غیر متعلقہ فرد کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاتا ہے۔ بحیثیت مسلمان اور اُمتِ محمدیہ ﷺ کا فرد ہونے کے ناطے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس معاملے میں بھی سنتِ رسول ﷺ اور منہجِ صحابہ کو نہ چھوڑیں‘ جو غلطیاں ہو چکی ہیں ان پر اللہ سے معافی مانگیں اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم کریں۔

زیرِ نظر مضمون میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اسلام اس معاملے میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے اور اس ضمن میں اکابرینِ امت کا کیا طریقہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ

اَحْسَنُ ط﴾ (النحل:۱۲۵)

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دو' اور بحث و مباحثہ کی ضرورت ہو تو وہ بھی عمدہ اور باوقار طریقے سے کرو۔''

بیعت کے مقتضیات میں یہ بات شامل ہے کہ اولی الامر اور صاحبِ منصب لوگوں کو نصیحت کی جاتی رہے۔ چنانچہ سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ)) قُلْنَا : لِمَنْ؟ قَالَ :((لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ)) (رواه مسلم)

''دین سراسر (وفاداری اور) خیرخواہی ہے''۔ ہم نے کہا: کس کے لیے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کے لیے' اُس کی کتاب' اُس کے رسول' مسلمانوں کے ائمہ اور عام مسلمانوں کے لیے۔''

☆ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مناصحة ولاة الأمر فلم يختلف العلماء فى وجوبها اذا كان السلطان يسمعها ويقبلها (الاستذکار:۵۷۹/۸)

''اُمراء اور لیڈروں کو نصیحت کرنا واجب ہے' اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے' جبکہ صاحبِ منصب اسے سنے اور قبول کرے۔''

☆ امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے ائمہ کو نصیحت کرنی چاہیے' حق بات میں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے' ان کی اطاعت کرنی چاہیے' اور رفق ولطف (انتہائی نرمی) کے ساتھ انہیں تنبیہ اور نصیحت کرنی چاہیے۔''

☆ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَرْضٰى لَكُمْ ثَلَاثًا وَيَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا، يَرْضٰى لَكُمْ اَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا، وَاَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، وَاَنْ تَنَاصَحُوْا مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ اَمْرَكُمْ، وَيَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا: قِيْلَ وَقَالَ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ)) (رواه مسلم)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین باتوں کو پسند کرتا ہے اور تین باتوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ پسند کرتا ہے کہ (۱) تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو' اور (۲) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو' اور (۳) اللہ نے جسے تمہارا حکمران بنا دیا ہے اس سے خیرخواہی کرو۔ تین چیزیں تمہارے لیے ناپسند کرتا ہے۔ (۱) قیل وقال یعنی بلامقصد بحث اور ہر مسئلہ میں بال کی کھال اتارنا' (۲) بہت زیادہ سوال کرنا' اور (۳) مال ضائع کرنا (یعنی اسراف اور فضول خرچی سے منع کرتا ہے)۔''

☆ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا)) (ابوداود)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے۔''

☆ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ))(رواه ابوداود)

''لوگوں کو ان کا مقام دو۔''

یعنی جو جس مقام اور مرتبے کا حامل ہے' اسے اس کا مقام دینا چاہیے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔

امیر یا صاحبِ منصب کو نصیحت کرنے کا طریقہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اولوالامر (امیر' صاحبِ منصب' علماء وغیرہ) کو نصیحت کرنے کا طریقہ اپنے ارشاد مبارک میں واضح اور دوٹوک الفاظ میں بیان فرمایا ہے' جسے سیدنا عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ بایں الفاظ روایت کرتے ہیں:

((مَنْ أَرَادَ أَنْ يَّنْصَحَ لِذِیْ سُلْطَانٍ بِأَمْرٍ فَلَا يُبْدِهٖ عَلَانِيَةً، وَ لٰكِنْ لِيَأْخُذْ بِيَدِهٖ فَيَخْلُوَ بِهٖ، فَإِنْ قَبِلَ مِنْهُ فَذَاكَ، وَإِلَّا كَانَ قَدْ اَدَّى الَّذِیْ عَلَيْهِ لَهُ))

(اخرجه احمد فى مسنده' والطبرانى فى مسند الشاميين' والحاكم فى المستدرك' والبيهقى فى السنن الكبرى' والطبرانى فى المعجم الكبير)

''جو شخص کسی امیر یا صاحبِ منصب کو نصیحت کرنا چاہتا ہو تو اعلانیہ (اور تشہیر کرکے) نہ

کرے' بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تخلیہ میں بات کرے (یعنی اس کے قریب تر ہو کر ون ٹو ون ملاقات کی صورت میں بات کرے)۔ اگر وہ نصیحت کو قبول کرلے تو فبہا' ورنہ نصیحت کرنے والے نے اپنا فرض ادا کرلیا۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا عمل: آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں جو فتنہ کھڑا ہوا تھا وہ بہت بڑے سانحے پر منتج ہوا' اور پھر ختم نہیں ہوسکا۔ اس وقت کسی نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ (یعنی آپ ان کو کیوں نہیں سمجھاتے کہ وہ ان معاملات کی اصلاح کریں) تو انہوں نے کہا:

((اَلَا تَرَوْنَ اَنِّی لَا اُکَلِّمُہُ، اَلَا اَسْمَعُکُمْ؟ وَاللّٰہِ لَقَد کَلَّمْتُہُ فیما بَینی وبَینہُ، ما دونَ اَن اَفتَتِحَ اَمرًا لَا اُحِبُّ اَن اَکُونَ اَوَّلَ مَن فَتَحَہُ' ولا اَقولُ لِاَحَدٍ یکونُ عَلَیَّ اَمیرًا))(متفق علیہ)

''آپ کا خیال ہے کہ میں تمہارے سامنے ان سے بات کروں گا؟ اللہ کی قسم میں نے ان سے تنہائی میں آداب کا خیال رکھتے ہوئے جو بات کرنی تھی کرلی ہے' میں اسے کھولنا نہیں چاہتا کہ میں کہیں ایسی بات کا سبب نہ بن جاؤں کہ جس کی ابتدا کرنے والا میں نہیں بننا چاہتا۔''

اس حدیث کی تشریح میں امام نووی' عیاض اور امام البانی نے کہا کہ اسامہ بن زید کی مراد یہ تھی کہ وہ امام (امیر) کی مخالفت کھلم کھلا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ نرمی اور خفیہ طریقے سے جو نصیحت کرنی تھی' وہ انہوں نے کرلی ہے۔ (فتح الباری' وغیرہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان: سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال رجل لابن عباس رضی اللّٰہ عنہما: آمر امیری بالمعروف؟ قال: اِن خِفتَ اَن یقتلك فلا تؤنّب الامام' فان کنت لا بُدَّ فاعلا، فیما بینك وبینہ)) (رواہ ابن ابی شیبۃ)

''ایک شخص نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا میں اپنے امیر کو معروف کا حکم کروں؟ تو ابن عباس نے فرمایا: اگر تجھے قتل کا خوف ہو تو امام کو تنبیہ مت کرو' اور تم ضرور کرنا ہی چاہتے ہو تو ایسی راز داری سے کرو جو صرف تمہیں اور اس امیر کے درمیان ہو۔''

ان دو روایات سے ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ پتا چلا کہ اگر امیر سے اختلاف ہو' یا اسے کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہو تو یہ کام راز داری میں کرنا چاہیے' آداب کا خیال رکھنا چاہیے' اور ایسا چرچا نہیں کرنا چاہیے کہ تمام متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگوں میں اس کا چرچا ہو۔

اولوالامر (امیر وغیرہ) کو نصیحت کرنے کی چار صورتیں

(۱) امیر کو اس طرح چھپ کر نصیحت کی جائے کہ صرف نصیحت کرنے والے اور امیر کو ہی پتا ہو۔
(۲) امیر کو لوگوں کے سامنے کھلم کھلا نصیحت کی جائے باوجود اس کے کہ خفیہ بھی کی جاسکتی تھی۔
(۳) امیر کو نصیحت تو خفیہ کی جائے لیکن پھر بعد میں اس کا لوگوں میں چرچا کیا جائے اور اسے پھیلایا جائے۔
(۴) امیر کا ''رد'' اس کی پیٹھ پیچھے یعنی لوگوں کی مجلسوں' مواعظ' خطبات اور دروس میں کیا جائے۔

پہلی صورت: یعنی امیر کو اس طرح چھپ کر نصیحت کی جائے کہ صرف نصیحت کرنے والے اور امیر کو ہی پتا ہو —— اس طریقے سے امیر کو نصیحت کرنا یا اختلاف کرنا ہی اصل اور بہترین طریقہ ہے' اور یہی شریعت کا حکم اور ہمارے اسلاف کا منہج ہے جنہوں نے ہمیشہ اہلِ بدعت اور خوارج کی مخالفت اختیار کی اور اسی طریقے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا۔ عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہم پڑھ چکے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث پاک میں نصیحت کرنے کا شرعی طریقہ بتایا گیا ہے کہ اعلانیہ اور برسر بازار نصیحت نہ کی جائے' بلکہ تخلیہ میں نرمی کے ساتھ نصیحت کی جائے' جیسا کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جواب دیا تھا۔ اس طرح کھلم کھلا نصیحت کرنا امر منکر ہے اور فتنہ پر منتج ہوتا ہے' جبکہ خفیہ طریقے سے نصیحت کرنا اصل طریقہ ہے جو خیر خواہی اور فتنے کا سد باب ہے۔

☆ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت:

وعن سعید بن جمھان قال: اَتیتُ عبداللّٰہ بن ابی اوفی وھو محجوب البصر، فَسَلَّمْتُ علیہ، قالَ لی: مَن انتَ؟ فقلتُ: انا سعید بن جُمھان' قال: فَما فَعلَ وَالِدُکَ؟ قال: قلتُ: قَتَلَتْہُ الْاَزَارِقَۃُ، قال: لَعنَ اللّٰہُ الاَزارقۃَ' لعن اللہ الازارقۃَ' حدثنا رسول اللّٰہ ﷺ اَنَّھُمْ کِلابُ النار، قال: قُلتُ:

اَلْاَزَارِقَةُ وَحدهُم اَمِ الْخَوارِجُ كُلُّهَا؟ قال: بل الخوارجُ كُلُّهَا، قال: قلتُ: فَاِنَّ السُّلْطَانَ يَظْلِمُ النَّاسَ، وَيفْعَلُ بِهِم، قال: فَتَنَاوَلَ يَدِي فَغَمَزَهَا بِيَدِهٖ غَمْزَةً شَدِيْدَةً، ثم قال: وَيْحَكَ يَاابْنَ جُمهانَ عَلَيْكَ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ، عَلَيْكَ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ اِنْ كان السلطانُ يَسْمَعُ مِنكَ فَأتِهِ فِي بَيتِهِ فَأَخْبِرْهُ بِمَا تعلمُ، فَان قَبِلَ مِنكَ، وَاِلاَّ فَدَعْهُ، فانك لَسْتَ بِأعْلَمَ مِنهُ))

(مسند احمد بن حنبل)

''سعید بن جمہان سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے ملا' اور وہ نابینا ہو چکے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا' تو انہوں نے کہا: کون ہو تم؟ میں نے کہا: سعید بن جمہان۔ انہوں نے کہا: تمہارے والد کے ساتھ کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ ان کو ازارقہ نے قتل کر دیا۔ انہوں نے فرمایا: اللہ کی لعنت ہو ازارقہ پر' اللہ کی لعنت ہو ازارقہ پر' ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ وہ جہنم کے کُتّے ہیں۔ میں نے کہا: ازارقہ اکیلا ہی یا سارے خوارج؟ انہوں نے کہا: سارے خوارج۔ میں نے ان سے کہا: بے شک امیر لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور ایسا ایسا کرتا ہے' تو انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر زور سے دبایا اور فرمایا: تم پر لازم ہے کہ سوادِ اعظم کو پکڑو' تم پر لازم ہے کہ سوادِ اعظم کو پکڑو۔ اگر امیر تمہاری بات سنتا ہے تو اس کے گھر میں جا کر اسے اطلاع دو' پھر اگر تمہاری بات مان لے تو ٹھیک ورنہ اسے چھوڑ دے' تو اس سے زیادہ نہیں جانتا۔''

اس روایت میں ایک جلیل القدر صحابیؓ نے کس طرح یہ بات سمجھائی کہ امیر کو نصیحت خفیہ کرنی چاہیے نہ کہ اعلانیہ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرامؓ حضور اکرم ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت تھی اور کسی بھی صحابیؓ کا قول یا فعل ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

☆ ابن نحاس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یختار الکلام مع السلطان فی الخلوة علی الکلام معه علی رؤوس الأشهاد (تنبیه الغافلین)

''امیر یا صاحبِ منصب کو خلوت میں جا کر سمجھانا زیادہ بہتر ہے اس سے کہ سب کے سامنے سمجھایا جائے۔''

☆ امام شوکانی فرماتے ہیں:

ینبغی لمن ظهر له غلط الامام فی بعض المسائل أن یناصحه ولا یظهر

الشناعة علیه علی رؤوس الأشهاد، بل کما ورد فی الحدیث أنه یأخذ بیده ویخلو به ویبذل له النصیحة ولا یذل سلطان الله

(السیل' ج٤' ص ١٤٥٧)

''جس شخص کو امیر کی کوئی غلطی نظر آئے تو وہ اسے تنہائی میں سمجھائے اور اس کی برائی کو سب کے سامنے نہ اچھالے جیسا کہ حدیث (اوپر عیاض والی حدیث) میں طریقہ بتایا گیا ہے' اور امیر کو ذلیل نہ کرے۔''

ہمارے اسلاف سے یہی منقول ہے کہ صاحبِ منصب اور اُمراء سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان سے کفر اور ان کے خلاف خروج لازم نہیں آتا' بلکہ ان کو شرعی طریقے سے نصیحت کرنا ہی واجب ہے جو انتہائی نرمی سے ہو اور مجالس اور لوگوں کے مجموں میں تذکرے نہ کیے جائیں۔ (نصیحة مهمة' ص٣٠)

☆ علامہ سعدی فرماتے ہیں:

علی من رأی منهم ما لا یحل أن ینبههم سرًا لا علنا بلطف وعبارة تلیق بالمقام (الریاض الناضرة' ص ٥٠)

''جو شخص کوئی ناگوار بات دیکھے تو خفیہ طریقے سے تنبیہ کرے نہ کہ اعلانیہ' نرمی کے ساتھ اور اس کے شایانِ شان کلمات کے ساتھ نصیحت کرے۔''

☆ شیخ ابن باز فرماتے ہیں:

الطریقة المتبعة عند السلف النصیحة فیما بینهم وبین السلطان والکتابة الیه او الاتصال بالعلماء الذین یتصلون به حتی یوجه الی الخیر، وانکار المنکر یکون من دون ذکر الفاعل فینکر الزنی وینکر الخمر وینکر الربا مِن دون ذکر مَن فعله ویکفی انکار المعاصی والتحذیر منها مِن غیر ذکر اَن فلانًا یفعلها لا حاکم ولا غیر حاکم

(المعلوم' ص ٢٢)

''امیر یا صاحبِ منصب کو نصیحت کرنے کا جو طریقہ ہمارے اسلاف سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ خط و کتابت کی جائے' یا جو علماء امیر کے مقربین ہیں ان کے واسطے سے نصیحت کی جائے کہ وہ خیر کی طرف امیر کو متوجہ کریں۔ اور کسی منکر کا انکار

فاعل کا ذکر کیے بغیر ہی ہونا چاہیے۔ لہٰذا زنا' شراب' سود پر رداس انداز سے کیا جائے کہ نہی عن المنکر اور اللہ کا ڈر اوا تو ہو لیکن فاعل کا تذکرہ نہ کیا جائے' خواہ وہ حاکم ہو یا غیر حاکم۔''

دوسری صورت: امیر کو لوگوں کے سامنے کھلم کھلا نصیحت کی جائے باوجود اس کے کہ خفیہ بھی کی جاسکتی تھی —— یہ صورت حرام ہے' کیونکہ:

(۱) یہ عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ والی حدیث کے خلاف ہے' جس میں خلوت کا حکم اور اعلانیہ نصیحت کی ممانعت ہے۔

(۲) آثارِ صحابہؓ اور اسلاف کے طریقے کے خلاف ہے' جیسے اُسامہ بن زید اور عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما وغیرہ کا فرمان اور عمل تھا۔

(۳) اس وجہ سے بھی حرام ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ((مَنْ اَهَانَ سُلْطَانَ اللّٰه فِی الْاَرْضِ اَهَانَهُ اللّٰه)) (سنن الترمذی) ''جس نے امیر کی اہانت کی تو اللہ اسے ذلیل کرے گا۔''

☆ شیخ صالح بن عبدالعزیز العثیمین ''مقاصدِ اسلام'' میں لکھتے ہیں:

''جب اُمراء کے پیچھے باتیں ہونی شروع ہو جائیں' انہیں کھلم کھلا نصیحتیں کی جانے لگیں اور اس کی تشہیر کی جانے لگے اور ان کو ذلیل کیا جانے لگے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ اس طرح کرنے والوں کو ذلیل کرے گا۔''

☆ شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اذا صدر المنكر مِن امير او غيره ينصح برفق خفية ما يستشرف اى مايطلع عليه احدٌ، فان وافق والا استلحق عليه رجلا يقبل منه بخفية

(نصيحة مهمة' ص ۳۳)

''جب کسی امیر وغیرہ سے کوئی منکر سرزد ہو جائے تو نرمی اور چھپ کر نصیحت کرنی چاہیے۔ اگر مان جائے تو ٹھیک ورنہ کسی شخص کے واسطے سے خفیہ نصیحت کرے۔''

تیسری صورت: امیر کو نصیحت تو خفیہ کی جائے' لیکن پھر بعد میں اس کا لوگوں میں چرچا کیا جائے اور اسے پھیلایا جائے —— یہ صورت حرام ہے' کیونکہ:

(۱) یہ عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ والی حدیث کے خلاف ہے' جس میں خلوت کا حکم اور اعلانیہ نصیحت

کی ممانعت ہے۔

(۲) یہ آثارِ صحابہ اور اسلاف کے طریقے کے خلاف ہے' جیسے اُسامہ بن زید اور عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما وغیرہ کا فرمان اور عمل تھا۔

(۳) یہ ریاکاری ہے اور اخلاص کی کمی ہے۔

(۴) یہ فتنہ ہے' اور جماعت میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے کی کوشش ہے۔

(۵) امیر کی اہانت ہے جس پر اللہ کی طرف سے سخت وعید آئی ہے (جیسا کہ اوپر حدیث گزر چکی ہے)

☆ شیخ صالح بن عبدالعزیز العثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب امیر یا صاحبِ منصب کے بارے اس کی پیٹھ پیچھے بات کی جائے' یا علی الاعلان اور تشہیر کی صورت میں نصیحت کی جائے تو یہ اس کی اہانت ہے جس پر اللہ کی طرف سے وعید آئی ہے' لہٰذا اس حوالے سے ان باتوں کی رعایت کرنا ضروری ہے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔'' (مقاصدِ اسلام' ص ۳۹۳)

چوتھی صورت: امیر کا ''رد'' اس کی پیٹھ پیچھے یعنی لوگوں کی مجلسوں' مواعظ' خطبات اور دروس (یعنی عوامی مقامات) میں کیا جائے —— یہ صورت بھی حرام ہے' کیونکہ:

(۱) یہ غیبت اور بہتان ہے' اور ان دونوں چیزوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

(۲) یہ اس لیے بھی جائز نہیں کہ اس طرح لوگوں میں چرچا کرنے سے فتنہ وفساد کھڑا ہوتا ہے۔

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَلَا أُنَبِّئُكُمْ مَاالْعَضْهُ؟ هِيَ النَّمِيْمَةُ: اَلْقَالَةُ بَيْنَ النَّاس)) (صحيح مسلم)

''کیا میں تمہیں بتاؤں ''العضہ'' کیا ہے؟ وہ چغلی ہے یعنی لوگوں میں چرچا کرنا۔''

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَتَدْرُوْنَ مَالْعَضْهُ؟)) قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ ، قَالَ: ((نَقْلُ الْحَدِيْثِ مِنْ بَعْضِ النَّاسِ اِلٰى بَعْضٍ لِيُفْسِدَ بَيْنَهُمْ))

''کیا تم جانتے ہو ''العضہ'' کیا ہے؟'' ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ لوگوں کی باتوں کو دوسرے لوگوں تک اس

لیے پہنچانا کہ فساد پیدا ہو۔''

(ہوسکتا ہے کوئی اس نیت سے نہ پہنچا رہا ہو' لیکن اس کے عمل سے فساد اور تفرقہ اور ایک دوسرے سے بغض وعداوت اور نفرت پیدا ہوتی ہو تو بھی اس سے بچنا چاہیے۔)

(۳) یہ چوتھی صورت بھی عیاض بن غنم کی اس حدیث کے خلاف ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

(۴) آثارِ صحابہ اور اسلاف کے طریقے کے خلاف ہے۔

(۵) امیر کی اہانت ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے۔

(۶) یہ اس لیے بھی جائز نہیں کہ یہی چیز بڑھتے بڑھتے لڑائی جھگڑے اور گالم گلوچ' اور قتل قتال تک پہنچا دیتی ہے۔ (جیسا کہ اکثر ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ ہم خیال اور ایک ہی نظریے کہ لوگ اس طرح کی حرکتوں سے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔)

اُمراء اور صاحبِ مناصب لوگ محض معاصی کے ارتکاب سے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتے' بلکہ ایسی صورت میں شرعی اور ماثور طریقے سے نصیحت کرنا ہی بہتر ہوتا ہے' اور وہ نصیحت ایسی ہو جس میں خیر خواہی ہو' نرمی اور لطف وکرم والا معاملہ ہو' نہ کہ لوگوں کے اجتماعات میں یا ایسے پلیٹ فارم پر جہاں ایک بار بات کہہ دی جائے تو واپس لوٹانا مشکل ہو جاتا ہے' جیسے سوشل میڈیا وغیرہ' کیونکہ اس سے لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بغض پیدا ہوتا ہے۔

امیر کے خلاف خروج یا دعوتِ خروج کیا صرف تلوار کے ساتھ ہی ہوتا ہے؟

☆ علامہ عبدالعزیز الراجحی فرماتے ہیں:

''عالمِ عرب کے مشہور عالم علامہ عبدالعزیز الراجحی سے پوچھا گیا کہ کیا حکام کے خلاف خروج صرف تلوار کے ساتھ ہی ہوتا ہے یا کسی اور طریقے سے بھی؟

انہوں نے فرمایا: جی ہاں اُمراء کے خلاف خروج جنگ وجدال اور تلوار کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور ان کے عیوب کو بیان کرنے اور ان کی تشہیر کرنے سے بھی' چاہے وہ تشہیر پرنٹ میڈیا پر ہو یا الیکٹرانک میڈیا پر' چاہے وہ منبر ومحراب پر ہو یا انٹرنیٹ پر' کیونکہ اسی سے لوگوں میں غصہ پیدا ہوتا ہے اور پھر نوبت خروج تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ پہلے ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا اور ان کے خلاف لوگوں میں خوب چرچا کیا گیا اور کہا گیا کہ حضرت عثمانؓ نے وہ راستہ

چھوڑ دیا ہے جو حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ اب یہ گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ وصول کر رہے ہیں' سفر میں پوری نماز پڑھتے ہیں' رشتہ داروں کو نوازتے ہیں' اور ان کو حکومتی مناصب پر بٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی باتوں کو پہلے خوب پھیلایا گیا اور پھر ان کے گھر کا گھیراؤ کیا گیا اور ان کو شہید کر دیا گیا۔''

(شرح المختار فی اصول السنة للراجحی' ص۲۸۹)

☆ علامہ احمد النجمی فرماتے ہیں:

''امیر کے خلاف خروج دو طرح کا ہوتا ہے: (۱) تلوار کے ساتھ' اور (۲) خروجِ قولی' یعنی انسان امیر کے بارے کلام شروع کر دے اور اس کی مذمت شروع کر دے تو یہ دراصل خروج کی طرف دوسروں کو دعوت دینا ہے۔''

(فتح الرب الغنی بتوضیح شرح السنة للمزنی' ص۵۱)

یہ بات بالکل درست ہے' کیونکہ اکثر خروج' قتل وقتال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت بعد میں آتی ہے' پہلے زبان سے ہی آغاز ہوتا ہے۔

☆ علامہ محقق ابن العثیمین فرماتے ہیں:

لایمکن خروج بالسیف الا وقد سبقه خروج باللسان

''خروج بالسیف اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک خروج باللسان نہ ہو۔''

کیونکہ لوگ اس وقت تک لڑنے بھڑنے اور امیر کے خلاف بغاوت کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے جب تک کہ ان کو اُبھارا نہ جائے۔

☆ علامہ صالح الفوزان سے پوچھا گیا: کیا خروج باللسان بھی خروج بالسیف ہی کی طرح ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

الخروج علی الحاکم بالقول قد یکون اشدّ من الخروج بالسیف' بل الخروج بالسیف مترتب علی الخروج بالقول

''حاکم پر خروج بالقول کبھی زیادہ سخت ہوتا ہے خروج بالسیف سے' بلکہ خروج بالسیف دراصل خروج بالقول ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔''

☆ علامہ مجاہد ربیع بن ہادی سے یہی سوال پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

بدایةُ الخروج بالکلام، الکلام فی تهییج الناس وتثویرهم وشحنهم

والقاء البغضاء بين الناس، هذه فتنة قد تكون اشدّ من السيف

''خروج کا آغاز ہی کلام سے ہوتا ہے' کیونکہ کلام ہی لوگوں کو اُبھارتا بھی ہے اور ان کے دلوں میں امیر سے بغض پیدا کرتا ہے۔ کلام کا فتنہ سیف کے فتنے سے زیادہ سخت ہے۔''

☆ عبداللہ بن عکیم الجہنیؒ فرماتے ہیں:

لا أُعينُ علٰى دَمِ خليفةٍ أبدًا بعدَ عُثمانَ: قال فيقالُ له: يا أبا معبدٍ أَوَ أَعَنْتَ علٰى دَمِهٖ؟ فقال: إني لَأَعُدُّ ذِكْرَ مَسَاوِيهِ عَوْنًا عَلٰى دَمِهٖ

(رواه ابن سعد في الطبقات، ج٦، ص١١٥، واخرجه ابن ابی شيبة في مصنفه، ج٦، ص٣٦٢ وغيرهما)

''میں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ (کے قتل) کے بعد کسی خلیفہ کا خون کرنے پر معاونت نہیں کی۔ ان سے کہا گیا: اے ابومعبد! کیا آپ نے ان کے قتل کرنے پر معاونت کی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوتاہیاں بیان کرنے کو ان کے قتل پر معاونت شمار کرتا ہوں (یعنی میں ان کی کوتاہیاں بیان کیا کرتا تھا' اور یہی قتل پر معاونت ہے)۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امیر کے خلاف باتیں کرنا اور اس کے خلاف لوگوں میں چرچا کرنا' چاہے منبر و محراب کے ذریعے ہو یا میڈیا کے ذریعے' یہ درست عمل نہیں ہے' کیونکہ اس سے لوگوں میں امیر کی اہانت اور عدم اطاعت پیدا ہوتی ہے جو فتنے اور تفرقے کا ذریعہ بنتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

جب لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ امیر یا صاحبِ منصب کے خلاف اس طرح محاذ نہیں قائم کرنا چاہیے تو وہ دلیل کے طور پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ جامع ترمذی کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِندَ سُلطانٍ جائرٍ))

''ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا بہت بڑا جہاد ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانِ رسول برحق ہے' لیکن اصل مسئلہ اس حدیث کو سمجھنے کا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں عِنْدَ سُلْطَان کا لفظ ہے' عند یعنی پاس' سامنے۔ دوسری بات یہ کہ یہ حدیث اعلان پر دلالت نہیں کرتی' بلکہ ہمیں اس حدیث کو عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے ساتھ ملا کر سمجھنا چاہیے جس میں اعلانیہ رد اور نصیحت سے منع کیا گیا ہے۔

☆ امام احمدؒ فرماتے ہیں:

''نصیحت کرنے میں دو چیزیں ہونی چاہیے: (۱) نرمی' اور (۲) حاضری' یعنی آمنے سامنے نہ کہ لوگوں میں چرچے۔''

☆ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''تنبیہ اور نصیحت نہایت نرمی سے ہونی چاہیے۔'' (شرح مسلم)

☆ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

''رؤساء کو ان کلمات اور اس طریقے سے مخاطب کرنا چاہیے جو شرعاً' عقلاً اور عرفاً مطلوب ہے۔'' (بدائع الفوائد)

☆ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

ان الجماعة حبل اللّٰه، فاعتصموا منه بعروته الوثقٰى (آداب الشريعه)

''جماعت اللہ کی رسی ہے' اس کو اس کے مضبوط کڑے سے پکڑ لو۔''

☆ ابن رجب الحنبلیؒ فرماتے ہیں:

''ائمۃ المسلمین کی اصلاح کرنا' ان کی رہنمائی کرنا' ان کو انصاف پر قائم رکھنا' حق پر ان کی مدد کرنا اور منکر پر ان کو نصیحت اور تنبیہ کرنا ضروری ہے' لیکن نہایت نرمی اور شفقت کے ساتھ' اور علیحدگی میں۔'' (جامع العلوم والحکم)

☆ مشہور محدث امام یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں:

''میں جب کسی کی کوئی خطا دیکھتا ہوں تو پردہ پوشی کرتا ہوں' اور اس کی طرف غلط طریقے سے متوجہ نہیں ہوتا' بلکہ تنہائی میں اسے سمجھاتا ہوں۔ اگر مان جائے تو ٹھیک ورنہ چھوڑ دیتا ہوں۔'' (سیر اعلام النبلاء)

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ملاحظہ ہو' ایک شخص نے حضرت علیؓ سے لوگوں کے سامنے کہا:

ياأميرَ المؤمنين: إنك أخطأتَ في كذا وكذا، وأنصحُكَ بكذا وبكذا

''یا امیر المؤمنین! آپ نے یہ اور یہ غلطی کی ہے' اور میں آپ کو یہ اور یہ نصیحت کرتا ہوں۔''

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إذا نصحتني فانصحني بيني وبينك، فإني لا آمن عليكم ولا على نفسي حين تنصحني علنًا بين الناس

''جب تو مجھے نصیحت کرنا چاہے تو تنہائی میں کیا کر' کیونکہ اس طرح برسرِ عام نصیحت

کرنے سے شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکوں اور تو مجھ سے محفوظ نہ رہ سکے۔''

☆ حافظ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وكان السلف إذا أرادوا نصيحة أحدٍ، وعظوه سرًا، حتى قال بعضهم: مَن وعظ أخاه فيما بينه وبينه فهي نصيحة' ومن وعظه على رؤوس الناس فإنما وَبخه

''ہمارے اسلاف جب کسی کو نصیحت کرنا چاہتے تو خفیہ نصیحت کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جس نے اپنے بھائی کو تنہائی میں نصیحت کی تو یہ نصیحت ہے' اور جس نے سب کے سامنے کی تو یہ ملامت کرنا اور ذلیل کرنا ہے۔''

☆ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

المؤمن يستر و ينصح، والفاجر يهتك ويعير (جامع العلوم' ۷۷)

''مؤمن ستر رکھتا اور نصیحت کرتا ہے' جبکہ فاجر ہتک کرتا اور عار دلاتا ہے۔''

فضیل بن عیاضؒ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن رجبؒ کہتے ہیں:

فهذا الذى ذكره الفضيل من علامات النصح، وهو ان النصح يقترن به الستر، والتعيير يقترن به الإعلان (الفرق بين النصيحة والتعيير' ۳۶)

''یہ جو فضیل نے کہا: یہ اصل نصیحت ہے' نصیحت میں پردہ پوشی ہوتی ہے جبکہ اعلان میں ہتک اور عار ہوتی ہے۔''

☆ امام ابوحاتم بن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نصیحت سراً کرنا ہی ضروری ہے' کیونکہ جو اپنے بھائی کو اعلانیہ نصیحت کر رہا ہوتا ہے وہ اس کی برائی کر رہا ہوتا ہے (یا اس کو مزید برا کر رہا ہوتا ہے) اور جو خفیہ نصیحت کرتا ہے وہ اسے مزید مزین کر رہا ہوتا ہے (یا مزید اچھا کر رہا ہوتا ہے)۔'' (روضۃ العقلاء' ۱۹۶)

☆ عبدالعزیز بن ابی داؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''پہلے لوگ جب نصیحت کرتے تھے تو نرمی سے کرتے تھے' چنانچہ ان کو اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر اجر ملتا تھا۔ اور اب تو جلاتے ہیں' غصہ دلاتے ہیں' ہتک کرتے ہیں۔'' (جامع العلوم' ۷۷)

☆ امام ابن حزم فرماتے ہیں:

إذا نصحتَ فانصح سرًّا، لاجهرًا، أو بتعريضٍ لابتصريحٍ، إلا لمن

لايفهم، فلا بُدَّ مِن التصريح له (رسائل ابن حزم)

''جب تو نصیحت کرے تو خفیہ کر نہ کہ کھلم کھلا' یا اشاروں کنایوں میں کر نہ کہ صراحت کے ساتھ۔ سوائے اس کے کہ وہ اگر اشارے کو نہ سمجھ سکے تو پھر صراحت ضروری ہے۔''

اور مزید فرماتے ہیں:

اگر تیری نصیحت میں خشونت ہوگی تو یہ تنفیر کا باعث بنے گی' اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ: ۴۴) ''(اے موسیٰ اور ہارون) تم دونوں فرعون سے نرمی کے ساتھ بات کرنا''۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا: ((يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا)) ''آسانی کرو مشکل نہ کرو اور بشارت دو' متنفر نہ کرو۔'' (متفق علیہ)

☆ امام شوکانی فرماتے ہیں:

''اگر امام یا امیر کی بعض مسائل میں غلطیاں نظر آئیں تو اسے نصیحت کی جائے اور لوگوں کے سامنے اس کی برائی نہ بیان کی جائے' جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی (ون ٹو ون ملاقات) میں نصیحت کرو اور امیر کو ذلیل نہ کرو۔'' (السیل الجرار)

☆ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ فرماتے ہیں:

إذا صدر المنكر من أمير أو غيره أن ينصح برفق خفية ما يشرف عليه أحد فإن وافق، والا استلحق عليه رجلاً يقبل منه بخفية

''جب امیر یا کسی اور سے کوئی منکر صادر ہو جائے تو اسے نرمی اور ایسے خفیہ طریقے سے نصیحت کی جائے کہ کسی اور کو پتا نہ چلے' اگر تو مان لے تو ٹھیک ورنہ کسی دوسرے ذریعے اور شخص کے ذریعے خفیہ نصیحت کی جائے۔'' (الدرر السنیۃ)

☆ شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ نہیں تھا کہ اولوالامر اور صاحبِ منصب لوگوں کے عیوب کی منبروں (میڈیا) پر تشہیر کی جائے' کیونکہ یہ چیز لوگوں کو سمع و طاعت فی المعروف سے بھی دور کر دیتی ہے' اور ایسی بغاوت پر اُبھارتی ہے جس کا نقصان ہے' فائدہ کوئی نہیں۔ ہمارے اسلاف سے اصل طریقہ جو منقول ہے' وہ تنہائی میں نصیحت کرنا ہے' اور خط و کتابت کرنا ہے' یا ان کے مقربین علماء وغیرہ کے ذریعے ان کو سمجھانے کی کوشش کرنا

ہے۔اور یہ اصلاح کی کوشش ایسے کرنی چاہیے جس میں گناہ کا ذکر تو ہو لیکن فاعل کا ذکر نہ ہو۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایسا فتنہ برپا ہوا جو حضرت عثمان' حضرت علی' اور بے شمار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت کی وجہ بنا اور آج تک ختم نہیں ہوسکا۔ کیونکہ وہاں بھی کچھ لوگوں نے علی الاعلان عیوب کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا' جس سے لوگ متنفر ہوئے اور امیر المؤمنین کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔'' (نصیحة الامة فی جواب عشرة أسئلة مهمة)

☆ امام محمد بن صالح فرماتے ہیں:

''اُمراء کو نصیحت کرنا ایک مشکل ترین کام ہے' اور یہ عام لوگوں کو نصیحت کرنے کی نسبت زیادہ اہم بھی ہے' لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے کیا جائے؟ ضروری ہے کہ یہ کام حکمت وبصیرت سے کیا جائے' جس کے لیے مندرجہ ذیل امور نہایت ضروری ہیں:

اوّلاً: یہ کہ امیر کی اطاعت فی المعروف واجب ہے۔ یہ ان کے لیے خیر خواہی ہے' کیونکہ جب آپ یہ بنیادی بات ہی نہیں سمجھیں گے تو اطاعت کیسے کریں گے۔ اور یہ اطاعت کس نے واجب کی ہے؟ اللہ عزوجل نے واجب کی ہے' جیسا کہ فرمایا: ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی''۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سنو اور اطاعت کرو''۔ اور صحابہ کرام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بیعت لی اس میں یہ بات شامل تھی' جیسا کہ عبادہ بن صامت کی بیعت ہے: کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ سنیں گے اور اطاعت کریں گے' تنگی میں بھی' آسانی میں بھی' دل مانے یا نہ مانے' اور تب بھی جب ہم پر کسی اور کو ترجیح دی جائے۔

ثانیاً: ہمیں اُمراء کی اطاعت فی المعروف کرنی چاہیے' اگرچہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے۔ یعنی اگر اُمراء فساق ہوں' شراب پیتے ہوں' جوا کھیلتے ہوں تب بھی اطاعت فی المعروف واجب ہے۔ ہاں اگر وہ کسی معصیت کا حکم کریں تو پھر اطاعت نہیں' اگرچہ وہ معمولی سی معصیت کیوں نہ ہو۔

ثالثاً: نصیحت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں لوگوں کو بغاوت پر نہ ابھارا گیا ہو' اور بغاوت پر ابھارنا صرف یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں سے کہا جائے کہ بغاوت کرو' بلکہ بغاوت پر ابھارنا یہ بھی ہے کہ امیر کی خوبیوں کو چھپایا جائے اور خامیوں کا چرچا کیا جائے۔ کیونکہ انسان بشر ہے' جب اس کے سامنے کسی کی خامیاں بیان کی جاتی ہیں اور خوبیاں چھپائی جاتی

ہیں تو انسان کے دل میں اس آدمی سے بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ (اور یہی بغض بغاوت' سرکشی' عدم اطاعت اور اجتماعیت کو توڑ کر افتراق کا سبب بنتا ہے۔)

رابعاً: نصیحت میں حکمت وبصیرت سے کام لینا چاہیے۔ یعنی امیر کو نصیحت کرتے ہوئے پہلے ان امور کی طرف متوجہ کرنا چاہیے جو شریعت (قرآن وسنت نہ کہ کسی انسان کے موقف) کی خلاف ورزی میں آتے ہیں۔ اور اس میں بھی اخفاء سے کام لینا چاہیے' جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب امیر یا صاحبِ منصب کو نصیحت کرنی ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں سمجھائے' نہ کہ لوگوں کے مجمع میں کھڑا ہو کر تشہیر کرے' کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا سلامتی والا راستہ یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کیا جائے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وبصیرت سے نوازا ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تشہیر اور چرچے کے بغیر کون کون سے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے نصیحت کی جاسکتی ہے۔

خامساً: امیر کو نصیحت کرتے ہوئے اس احترام کو ملحوظ رکھا جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ امیر کا احترام عام لوگوں کے احترام کی طرح نہیں ہوتا۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے پاس ایک عام فاسق آدمی آتا ہے' آپ اس کی پروا بھی نہیں کرتے' نہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اور نہ اس سے کلام کرتے ہیں۔ لیکن امیر کا معاملہ برعکس ہے' امیر کو لوگوں کے سامنے ذلیل کرنا اور اس کے عیوب کا چرچا کرنا بہت نقصان دہ ہے اور کئی مفاسد کا پیش خیمہ ہے۔'' (خطبة مسجلة)

☆ علامہ صالح الفوزان ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

''سوال: نصیحت کرنے کا' خاص طور پر حکام کو نصیحت کرنے کا اصل منہج کیا ہے؟ کیا ان کے افعالِ منکرہ کی تشہیر کرنی چاہیے؟ یا تنہائی میں سمجھانا چاہیے؟ امید ہے آپ اس مسئلے میں اصل منہج کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔

جواب: کوئی بھی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے امیر اور حکام بشر اور خطا کار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معصومین نہیں ہیں' لیکن ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم کھلم کھلا تشہیر کے انداز میں ان کی خطاؤں کا چرچا کرنے لگ جائیں اور ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں' اگرچہ وہ ظلم وزیادتی بھی کریں' اگرچہ وہ معصیت کا ارتکاب بھی کریں۔ یہاں تک کہ جب وہ کفر بواح یعنی کھلم کھلا کفر کریں تب ہم اپنا ہاتھ کھینچ سکتے ہیں' جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا۔ اُمراء اگر گناہ گار

ہوں‘ ظلم وزیادتی کرنے والے ہوں تو بھی صبر ہی بہتر ہے اور یہی مسلمانوں کی وحدت کا پاسبان ہے۔ جبکہ ان کی کھلم کھلا مخالفت اور انکار میں بڑے بڑے مفاسد ہیں۔ ان کے کسی منکر کا ارتکاب کرنے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا نقصان تفرقے اور پھوٹ ڈالنے سے ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ شرک اور کفر کا ارتکاب کرنے لگ جائیں تو وہ علیحدہ بات ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے منکر پر خاموشی اختیار کی جائے‘ بلکہ اس کا علاج کرنا چاہیے‘ لیکن وہ علاج سلامتی والے طریقے سے ہو‘ تنہائی اور خط وکتابت وغیرہ کی شکل میں ہو۔ اور پھر یہ خط وکتابت بھی ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ آپ اسے (ان خطوط اور تحریروں کو) لوگوں کو دکھاتے پھریں‘ بلکہ یہ بھی خفیہ ہی ہونی چاہیے۔ جبکہ ایسی خط وکتابت یا تحریر وتصویر اور اس کی لوگوں میں تقسیم (پرنٹ کر کے یا میڈیا پر) یہ عمل جائز نہیں ہے‘ کیونکہ یہ تشہیر ہے‘ اور یہ سرعام بات کرنے کی طرح ہے‘ بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ ویسے کی ہوئی بات ممکن ہے لوگ بھول جائیں لیکن خط اور تحریر (یعنی طبع شدہ مواد یا ریکارڈ شدہ ویڈیو‘ آڈیو) لوگوں کے پاس سالہا سال باقی رہے گی۔ لہٰذا یہ حق نہیں ہے۔‘‘ (الاجوبة المفيدة‘ ۲۷)

☆ ایک اور سوال کے جواب میں الشیخ فوزان فرماتے ہیں:

’’خط وکتابت خفیہ ہو‘ ایسی خط وکتابت نہ ہو کہ آپ انٹرنیٹ وغیرہ (سوشل میڈیا) پر اس کی تشہیر کرتے پھریں اور لوگوں میں شائع اور تقسیم کریں‘ یہ جائز نہیں ہے۔ یہ لوگوں میں تقریر کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے‘ کیونکہ ویسے کی ہوئی بات لوگوں کو کسی وقت بھول بھی جائے گی لیکن میڈیا پر شائع شدہ بات لوگوں کے پاس باقی رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’دین خیر خواہی کا نام ہے‘ دین خیر خواہی کا نام ہے‘ دین خیر خواہی کا نام ہے‘‘۔ صحابہؓ نے پوچھا: کس کے لیے تو فرمایا: ’’اللہ کے لیے‘ اس کی کتاب کے لیے‘ اس کے رسول کے لیے‘ اور عام مسلمانوں اور ان کے حکام کے لیے۔‘‘ (مسلم)

جبکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین چیزوں سے راضی ہوتا ہے‘ یہ کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے‘ اور یہ کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا جائے‘ اور یہ کہ اولوالامر کو نصیحت کی جائے۔‘‘

اولوالامر کو ایسے طریقے سے نصیحت کرنا کہ ان کی خطاؤں کی تشہیر ہو‘ اگرچہ نیت اچھی بھی ہو تب بھی یہ اصل منہج نہیں ہے‘ کیونکہ نہی عن المنکر کرنے کا طریقہ بھی ہمیں شریعت نے بتایا ہے‘ اور شریعت کے راستے سے ہٹ کر نہی عن المنکر کرنا خود ایک منکر ہے۔

خلاصۂ کلام

کسی بھی شخص کو‘ چاہے وہ اولوالامر میں سے ہو یا عام شخص‘ نصیحت یا تبلیغ کرتے ہوئے ان آداب اور تعلیمات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے جو اللہ کی کتاب قرآن حکیم‘ رسول اللہ ﷺ کی سنت‘ صحابہ کرام اور اسلاف کے منہج میں ہم تک پہنچی ہیں۔

عقلاً بھی تقاضا یہی ہے کہ اگر آپ اپنے موقف میں مخلص ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اگلا شخص آپ کی بات کو قبول کرے تو اپنی بات منوانے کے لیے خلوص کے ساتھ ساتھ حکمت و بصیرت کا سہارا بھی لینا چاہیے‘ کیونکہ رازداری کے سمجھانے اور ساری پبلک میں شور شرابا کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس طرح کرنے سے ضد تو پیدا ہوتی ہے‘ محبت نہیں۔

تبلیغ کی کوئی حد (limit) نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی اور صرف ستر‘ بہتّر (۷۰‘۷۲) لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا‘ لیکن وہ خود کامیاب ہو گئے۔ اصل کامیابی اپنی اُخروی نجات ہے‘ لہٰذا فوکس اس پر ہونا چاہیے کہ میری کامیابی کیا ہے اور کیا نہیں ہے‘ نا کہ اس پر کہ میرا موقف میری سانسیں ختم ہونے سے پہلے غلبہ پا جائے۔ جب نظریہ یہ بن جاتا ہے کہ میرا موقف یا میرا نظریہ غالب کیوں نہیں آ رہا تو مایوسی چھا جاتی ہے‘ اور یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب انسان سب سے زیادہ کمزور ہو جاتا ہے‘ اور کمزوری کے اس لمحے میں نہ صرف شیاطین بلکہ انسان نما شیاطین بھی بڑی آسانی سے اسے شکار کر لیتے ہیں۔ اس لیے مایوسی کا شکار ہو کر کبھی بھی اپنے آپ کو اتنا کمزور نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی بھی شخص آپ کی نکیل پکڑ کر کبھی اِدھر کرے اور کبھی اُدھر کرے۔

ایک فرد کا کام بس اتنا ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام مسلسل کرتا چلا جائے۔ نتیجے کا فوراً ظاہر کرنا نہ کسی کے بس میں ہے اور نہ کسی کی ذمہ داری ہے‘ البتہ کام کرنے میں اخلاقی لحاظ سے کبھی بھی اس منہج کو ترک نہ کرے جو اسلام نے ہمیں دیا ہے۔

مروجہ سیاسی جماعتوں کے جھگڑوں کی طرح الزام تراشی‘ بہتان بازی‘ میڈیا ٹاک جسے ہر متعلقہ اور غیر متعلقہ سنے اور دیکھے‘ اور پھر اس میں بھی مروّجہ سیاسی جماعتوں کے طریقہ کار کی طرح اپنے تئیں ثبوت لا لا کر دکھانا اور پیش کرنا کسی بھی صورت دینی جماعتوں اور ان کے کارکنان اور رفقاء کے شایانِ شان نہیں‘ کیونکہ یہ طریقہ مخالف فریق کا تو ہو سکتا ہے‘ دین کے

مبلغ اور داعی کا نہیں۔

داعی کا مزاج خیر خواہانہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کو نیچا دکھانے اور رسوا کرنے والا' جبکہ مروجہ سیاسی جماعتوں میں فریق مخالف کو نیچا دکھا کر ووٹ توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے' اور چند ایک ووٹ توڑ کر اپنے ساتھ ملانے سے زیادہ ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں میں دوسروں کے ووٹ توڑ کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں ہر جائز و ناجائز حربہ آزمایا جاتا ہے' جبکہ داعی کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔ داعی کا ایک راستہ بند ہو تو وہ جواز کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ ایک مورچہ چھوٹے تو دوسرے میں بیٹھ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!!

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی فکر انگیز تالیفات

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مجلد 400 روپے، غیر مجلد 200 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

فلسفہ خیر و شر اور حیاتِ انسانی

راحیل گوہر☆

اس دنیا میں خوشی اور غم کے پیمانے ہر شخص کے لیے الگ ہیں‘ اکثر ایک کی خوشی دوسرے کے لیے غم یا دکھ کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے نزدیک خیر اور شر کے پیمانے اور اس کے احساسات جدا جدا ہیں۔ بظاہر تو خیر وہ ہے جو انسانوں کی اجتماعیت کے لیے پسندیدہ اور قابل قبول ہو جب کہ اس کی معکوس شکل سوادِ اعظم کے لیے ناقابلِ قبول اور کراہیت آمیز ہو۔ دراصل انسان خیر و شر دونوں کی بیک وقت صلاحیتوں کا حامل ہے‘ جو بلا واسطہ ربّ کائنات سے انسان کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ پس ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس) اس کی دلیل ہے۔

اس دُنیوی زندگی میں انسان کے افعال کی دو ہی صورتیں ہیں: فطری اور اخلاقی یا دیگر الفاظ میں اعضاء کے افعال اور دل کے افعال۔ چنانچہ ہمارا عمل اسی صورت میں اخلاقی ہوسکتا ہے جب کہ ہم اسے حالت اختیار میں کریں نہ کہ کسی دباؤ کے زیر اثر۔ اخلاقی فعل انسان کی اکتسابی ملک ہے اور اس کے برخلاف علم وہبی ہے‘ جس میں سے کچھ تو وحی کے ذریعے سے اور کچھ روشنی طبع سے عطا ہوا ہے۔ اگرچہ نزولِ وحی سے پہلے بھی انسان پر یہ فرض تھا کہ وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے‘ خیر و شر میں تمیز کرے‘ نیکی‘ سچائی اور عدل کی زندگی بسر کرے۔ سمیع و بصیر ہونے کی صلاحیت نے انسان کو عبدیت و اطاعت کا مکلّف بنایا ہے۔

ربّ قدیر و علیم نے انسان کے وجود میں فجور و تقویٰ کا مادہ رکھ کر اور اسے ارادہ و اختیار کی آزادی دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اب یہ انسان کے اپنے اوپر منحصر ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں سے کس راستے کا انتخاب کرتا ہے اور اپنی زندگی کس ڈھب اور اور کن طریقوں پر

☆ ملتزم رفیق تنظیم اسلامی‘ حلقہ وسطی‘ کراچی

گزارتا ہے۔ انسان کا طرزِ زندگی دراصل عکس ہوتا ہے اس کی فکر اور سوچ کا۔ انسان کے کردار پر اس کی سوچ کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس طرح کے عقائد و نظریات ہوں گے‘ اعمال بھی اسی کے مطابق ہوں گے۔ گویا انسان کا نظریۂ زندگی ہی اس کے تمام اعمال و افعال پر حکمرانی کرتا ہے۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی سوچ ایک اندرونی و ذہنی عمل ہے جس میں چیزوں اور واقعات کو مختلف انداز میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ یعنی سوچ ایک داخلی عمل ہے جو فرد کے ماضی کے تجربات‘ موجودہ حالات اور انسان کی اندرونی کیفیات سے متعین ہوتا ہے۔ انسان حیوانات سے اسی بنا پر فائق ہے کہ حیوانات میں شعور ہے‘ عقل نہیں ہے۔ جبکہ انسان میں عقل بھی ہے اور شعور بھی‘ چنانچہ اسی عقل و شعور کے امتزاج سے انسان غور و فکر کے مراحل طے کر کے اپنے لیے ہدایت کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ تاریخ انسانی میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت کا بہترین نمونہ ہیں۔ آپؑ نے غور و فکر کے مدارج طے کر کے ہی ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اور وہ بالآخر راہِ ہدایت سے فیض یاب ہوئے تھے۔

مذکورہ بالا تمام حقائق کے علاوہ ایک اور بھی حقیقت نفس الامری ہے کہ انسان کے افکار و اعمال میں خیر و شر پھیلانے میں معاشرے کا بھی بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ ایک طرف جہاں معاشرہ کی کچھ سعید ہستیاں انسانوں میں اعلیٰ اخلاق اور مہذّب طرزِ زندگی کی راہ دکھاتی ہیں‘ دنیا و دین کی بھلائیوں سے ان کے دامن بھرتی رہتی ہیں‘ وہاں دوسری طرف معاشرہ کے ناسور اپنی خباثتوں اور مجرمانہ ذہنیت کے تحت ایک تناؤ‘ خلفشار اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کے راہ و رسم اور طرزِ عمل میں حق تلفیاں‘ ناانصافیاں‘ جبر و استبداد اور عصبیت پسندی کی روش نمایاں ہوتی ہے جس سے سماج میں ایک ہیجان اور احساس محرومی کی تلخیوں کا زہر انسانیت کی رگوں میں سرایت کر رہا ہوتا ہے‘ جو معاشرہ کی رگوں میں مایوسیوں اور منفی سوچوں کا اندھیرا پھیلا رہا ہوتا ہے۔ اور یہ سب انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ہوتا ہے۔

دراصل قوموں کی بقا اور ترقی ان کے تہذیب و تمدن کی نشو و نما اور ان کے اعلیٰ اخلاق اور احترامِ آدمیت کی روش پر منحصر ہے۔ قومیں اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان کے اخلاق زندہ رہتے ہیں‘ اگر اخلاق میں زوال آجائے تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد اپنی تصنیف ’’اسلامی نظریۂ حیات‘‘ میں لکھتے ہیں:

''اخلاق کا تعلق خدا اور بندے کے باہمی رشتے سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان قائم ہوتے ہیں۔ معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات' سماجی برتاؤ ہو یا افرادِ خاندان سے سلوک' اسلام سب کو اخلاقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن وسنت میں معاملات و معاشرت سے متعلق بالتفصیل ان صفات کا ذکر ہے جو خدا کو پسند یا ناپسند ہیں۔''

چنانچہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((..... وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ، لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا، لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ))

(صحيح مسلم، باب الدعاء في الصلاة)

''.....اور تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی فرما کہ تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا' اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے' اور ان کو تیرے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا۔''

خیر وشر کی دو ممکنہ صورتیں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں۔ ایک فاعلی صورت اور دوسری مفعولی۔ فاعلی صورت میں ہم کسی کو خیر مہیا کر رہے ہوتے ہیں اور مفعولی حالت میں ہم خود کسی ذریعے یا وسیلے سے خیر حاصل کرتے ہیں۔ بعینہٖ شر اور فساد کو پھیلانے میں بھی ہم کبھی فاعل اور کبھی مفعول کا کردار ادا کرتے ہیں' دانستہ یا نادانستہ دونوں کیفیات میں ہم سے یہ اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اس بات کو ایک اور انداز میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس دنیا میں اپنے طرزِ عمل سے اردگرد کے لوگوں کو تہذیب' انسانیت اور اعلیٰ قدروں سے قریب کر رہے ہوتے ہیں یا انہیں ان سب سے دور۔ دراصل ایک تبلیغ خاموشی کی زبان سے یعنی طرزِ عمل اور رویے سے بھی ہوتی ہے' جسے بدن بولی کہتے ہیں' جبکہ بسا اوقات بڑے بڑے علمی' ادبی' مذہبی مباحث' فکری مقالات اور افلاطون کے مکالمات بھی بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ تربیت پیدا شدہ حالات کے درمیان رہنمائی کے ذریعے کی جاتی ہے نہ کہ مجرد قسم کی وعظ خوانی کے ذریعے۔ بقول شاعر ؎

واعظ کے پند سے دل پہ اثر کیا خاک ہو
خواہشِ دل اور ہے طرزِ بیاں کچھ اور!

فرانسیسی سرجن اور بائیلوجسٹ ڈاکٹر الیکسس کیرل (Alexis Carrel) اپنی کتاب

The Unknown Man میں لکھتے ہیں:

''موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے۔ لیکن یہ ذرائع دولت کے مقصد تک نہیں پہنچاتے' یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اثر سے انسان صبر وضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرتا ہے جو ذرا دشوار ہوتا ہے۔''

عالمِ انسانیت کی دورِ حاضر کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا نظر آتا ہے کہ تہذیبِ جدید ایسے انسان پیدا کر ہی نہیں سکتی جن میں فنی تخلیق' ذہانت و جرأت اور دانش وفراست ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے صاحب اقتدار طبقے میں جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے' ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں انحطاط واضح نظر آتا ہے۔ اس صورتِ حال میں تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی اور ناگزیر ضرورتوں اور احتیاجات کو کما حقہٗ پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کر رکھی تھیں اور یہ تہذیب ایسے لوگ پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت و فطانت اور ہمت و جرأت کے مالک ہوں اور تہذیب کو اس دشوار گزار راستے پر سلامتی و آسودگی کے ساتھ لے جا سکیں' جس پر آج انسانیت ٹھوکریں کھا رہی ہے اور احترامِ آدمیت دنیا سے بتدریج مٹتا جا رہا ہے۔

جب تک سماجی روایات نہ بدلیں' محض قانون بنانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس قسم کی چیزیں کبھی قانون کے ذریعہ نافذ نہیں ہو سکتیں۔ دنیا کا قانون طبیعی طور پر تو نتیجہ خیز ہو سکتا ہے مگر اخلاقی طور پر فکر اور نظریے کو بدلے بغیر ثمر آور نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستِ مدینہ میں حرمت شراب کو تین مراحل میں طے کیا گیا۔ کسی چیز پر عامل ہونے کے لیے اولین شے ذہن سازی ہوتی ہے۔ مکہ کی ۱۳ برس کی ذہن سازی نے وہ غیور' شجاع اور دینی حمیت میں ڈوبے وہ سپاہی اور مجاہدین تیار کیے جو دین کی آبرو اور اس کی آبیاری کے لیے جان ہتھیلی پر رکھے پھرتے تھے۔ وسائل کی کمی کسی میدان میں بھی ان کے پیروں کی زنجیر نہیں بنی۔ بقول علامہ اقبال ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

اس حیاتِ دنیوی میں اکثر و بیشتر خلافِ مزاج باتیں پیش آتی رہتی ہیں' کیونکہ زندگی تو نام ہے ناموافق باتوں کا سامنا کرتے ہوئے سفرِ حیات طے کرنے کا۔ جو انسان جتنا زیادہ بامقصد اور بااصول ذہن کا حامل ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کو اپنی پسند اور مرضی کے خلاف معاملات کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس صفت کی ضرورت دنیوی معاملات میں بھی پیش آتی ہے اور دینی معاملات میں بھی۔

ہم جس دنیا میں بستے ہیں وہ اسباب وعلل کی دنیا ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے واقعات اور حادثات کسی نہ کسی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس میں کچھ ہم انسانوں کا اور کچھ تکوینی مصلحتوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن ہر انسان اپنے ساتھ پیش آنے والے ناخوشگوار حالات کا ذمہ دار دوسروں کو ہی گردانتا ہے' اپنا محاسبہ کرنا اس کے حاشیہ خیال میں ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی خیال آ بھی جائے تو اس کا برملا اظہار کرنے کی جرأت ہی اس میں نہیں ہوتی اور وہ حاالات کی گتھی کو کبھی سلجھا نہیں پاتا۔ بقول شاعر۔

الٰہی خیر ہو الجھن پہ الجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ ان کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عادل اختر اپنی تصنیف ''چہ باید کرد'' میں رقم طراز ہیں:

''اخلاقی اقدار کا امین درمیانہ طبقہ ہوتا ہے۔ ہمت' حکمت' علم اور عقل اس طبقے کی میراث ہوتی ہے۔ اس طبقے کے اندر لڑنے مرنے اور آگے بڑھنے کا جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ مگر اس طبقے کی تعداد اور طاقت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔''

فطری حالت میں نفس انسانی علم سے خالی ہوتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (النحل)

''اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل (اور ان کے علاوہ اور اعضاء) بخشے تاکہ تم شکر ادا کرو۔''

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ پیدائش کے وقت بچے کا ذہن یکسر صاف ہوتا ہے' ماسوا اس کی جبلی ضرورتوں' بھوک' نیند' موت وغیرہ کے۔ جبکہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنے

اندر استعداداتِ علم (Faculties of Knowkedge)' سماعت و بصارت اور سوچنے والا دل لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ چنانچہ یہ جبلی صلاحیتیں اس کا جوہر ہوتی ہیں جبکہ استعداداتِ علم کو تصرف میں لا کر اس کی شخصیت پروان چڑھتی ہے اور اس کے نظریات' عقائد اور اخلاقی تصورات تشکیل پاتے ہیں۔ آدمی کے ذہنی ارتقا کے لیے لازمی ہے کہ اس کا پیدائشی جوہر اور اس کی شخصیت بیک وقت ترقی کرتے رہیں اور ایک دوسرے کی ہم آہنگی میں ایک دوسرے کے اوپر اثر انداز ہوں۔ لیکن اکثر ان دونوں کا متوازی سفر کرنا محال ہوتا ہے۔ جوہر غالب آ جائے تو شخصیت مضمحل ہونے لگتی ہے اور شخصیت توفق حاصل کر لے تو جوہر سسکنے لگتا ہے۔

ہر انسان کے اندر ایک آدمی بھی ہوتا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگوں میں آدمیت کا غلبہ ہوتا ہے اور کچھ میں انسانیت کا ترفع۔ شعورِ ذات (self consiouness) کا صحیح ادراک آدمی کو انسان کے درجہ پر فائز کرتا ہے اور پھر وہ اپنی بالقوّہ (potential) استعدادات وصلاحیتوں کی کشادہ پگڈنڈیوں پر اپنے لیے وہ راہ اختیار کرتا ہے جو اسے اپنے خالق اور پالن ہار تک پہنچنے کے لیے روشنی دکھاتی ہے۔ جب کہ محض آدمیت کا رنگ انسانی شخصیت کو مادی لذتوں کا ہی اسیر بنا دیتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی کو اپنے باطن میں جھانک کر اپنے مقصد زندگی کو سمجھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ خیر و شر کا اصل پیمانہ عقل و خرد کی روشنی میں ہی واضح نظر آ سکتا ہے۔ ورنہ نفس کی خواہشات کے ابھرتے تقاضے آدمی کو انسان بننے ہی نہیں دیتے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ''اخلاق اور فلسفۂ اخلاق'' میں لکھتے ہیں:

''انسان اپنے نفس کی گہرائی میں ایک قوت محسوس کرتا ہے جو اس کو برے کام سے اس وقت روکتی ہے جب وہ اس کو کرنے پر ترغیب دیا جاتا ہے' اور وہ برابر اس کے درپے رہتی ہے کہ کسی طرح وہ اُس کو وہ عمل نہ کرنے دے' اور وہ جب اس عمل کے کرنے پر ہٹ کرنے لگتا ہے اور اس کو شروع کر دیتا ہے تو وہ اثناءِ عمل میں محسوس کرتا ہے کہ اس قوت کے اثر کو نہ ماننے کی وجہ سے اُس کو راحت وسکونِ قلب حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح یہ قوت اُس کو واجب اور ضروری اعمال کے کرنے کا حکم دیتی ہے' اور اگر وہ حکم کے زیر اثر اس کام کو کرنے لگتا ہے تو اس عمل کے دوام واستمرار پر اُس کو بہادر بناتی ہے' اور جب وہ اس کو مکمل کر لیتا ہے تو اطمینان اور راحت پاتا ہے اور نفس کی رفعت و بلندی کو محسوس کرتا ہے۔ ایسی آمر وناہی (حکم کرنے والی اور منع کرنے والی) قوت کا نام

وجدان یا ضمیر ہے۔''

انسانی نفس کا صدور روحِ مطلق سے ہوا ہے اور تمام افراد کی روحیں مل کر ایک جوہر بناتی ہیں جسے انسانِ مطلق یا روحِ انسانیت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر ایک روح مادے کے اندر شامل ہے اور بتدریج غیر مادی بنتی ہے۔ اس کام کے لیے اس میں بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں موجود ہیں۔ ان میں نظری قوتیں سب سے برتر ہیں کیونکہ علم ہی روح کی جان ہے۔

انسان کے افعال نیک اس وقت کہلاتے ہیں جب وہ اپنی فطرتِ اصلی کی پیروی کرتا ہے' جو قابلِ تحسین نفس کا آزاد عمل ہے۔ پسندیدہ وہ کام ہے جو عقلی غور و فکر کے بعد کیا جائے اور مستحق جزاء یعنی عالمِ افلاک میں پہنچا دینے والی کائنات کے ناموسِ الٰہی کی پابندی ہے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ قلبِ انسانی میں روحانی ترقی کی طلب ہو' اس لیے کہ سب سے افضل نیکی محبت ہے جو محبوبِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ سے وصل کی طالب ہے' اور اس آرزو کے اثر کے تحت انسان اس دنیوی زندگی میں بھی مذہبی رواداری سے کام لیتا ہے' مخلوق کا درد اسے اپنا درد محسوس ہوتا ہے اور وہ ہر برائی کو احسن طریق پر دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ قرآن حکیم کے اس حکم کے بموجب:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾﴾ (حٰم السّجدہ)

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو' (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ اور یہ بات انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں' اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں۔''

پروفیسر محمد منور نے اپنی تصنیف ''برہانِ اقبال'' میں لکھا ہے:

''ایک اور بات جو قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ تاریخِ آدم حیوانی جبلتوں اور روح کے مابین ایک مستقل کشمکش کا نام ہے۔ بقولِ برگساں' ارتقا زندگی کی اس جدوجہد کا نام ہے جو وہ مادے کے تسلط سے نجات پانے کی خاطر عمل میں لاتی ہے۔ مادہ مادے کی طرف کھنچتا ہے اور ظاہر ہے انسانی وجود میں ٹھوس وزنی حصہ

مادے ہی کا ہے اور وہی بالعموم حاوی رہتا ہے۔ روح کی لطافت کو محنت سے تقویت دینا پڑتی ہے' جب کہیں وہ وجود کے مادی حصے کو مادے کی نذر ہونے سے بچا پاتی ہے۔ انسان ذرا غافل ہو تو پستی میں چلا جاتا ہے۔''

خیر و شر کے مسئلے کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنے کے لیے مجرد ہمارا فہم' علم اور سطحی مشاہدہ کافی نہیں ہے۔ انسان کو ودیعت کیے ہوئے حواسِ خمسہ نے بلاشبہ کائنات کی بہت ساری گتھیوں کو سلجھا کر اس کو زندگی کی سہولتیں اور محیرّ العقول ایجادات و اختراعات سے نوازا ہے' اس لیے عقل کی اہمیت سے کُلّی طور پر انکار ممکن نہیں۔ تاہم اللہ کی تائید و نصرت ساتھ نہ ہو تو بہت سے عقدے نہیں کھل پاتے اور انسان لاعلمی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم ملا ہے اس کی قلت اور محدودیت کا اعتراف تو انسان ہی نہیں فرشتوں نے بھی کیا ہے' قرآن حکیم میں ملائکہ کا یہ قول نقل ہوا ہے:

﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾﴾

(البقرۃ)

''انہوں نے کہا تو پاک ہے' جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ بیشک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔''

چنانچہ اسلام کی تعلیمات کے بغور مطالعہ کے بغیر ہم نیکی و بدی اور خیر و شر کا صحیح فہم حاصل نہیں کر سکتے۔ مجرد علم ہر گتھی کو سلجھانے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا جب تک اللہ کی ہدایت رہنمائی نہ فرمائے۔ قرآن حکیم نے جو خیر و شر کا نظریہ پیش کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ معروف اور جانی پہچانی چیز کو خیر کہتے ہیں۔ فطرت جسے قبول کرنے میں سوچ بچار نہیں کرتی اور مانوسیت کا ایک لطیف احساس انسان کو اپنے قلب و ذہن میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ جب کہ شر وہ ہے جسے منکر کا نام دیا گیا ہے اور ہر قسم کے منکرات سے اجتناب کرنے پر مذہب زور دیتا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ انسان بذاتِ خود بھی معروف پر عمل پیرا ہو اور منکرات سے بچے بلکہ دوسروں کو بھی معروف کے کرنے کا حکم دے اور منکرات پر عمل کرنے سے روکے۔ از روئے قرآن حکیم:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور

اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔''

نیکی جو اپنے حقیقی تقاضوں کے ساتھ کی جائے وہی دراصل خیر اعلیٰ ہے اور اس خیر اعلیٰ کے لیے انسان کو اپنی کئی خواہشات اور آرزوؤں کو دبانا پڑتا ہے۔ بیج کو زمین کے سینے میں دبا کر اس کی آبیاری کی جائے تب ہی وہ پہلے پودا اور پھر درخت بنتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان خود کو خواہشات اور نفس کے حصار میں مقید کر دے تو نیکی اپنا پھیلا ہوا دامن سمیٹ لیتی ہے اور یوں ایک انسان خیر سمیٹتے سمیٹتے شر و فساد کے اس جال میں جا گرتا ہے جو شیطانی قوتوں نے روزِ ازل سے ہی ابن آدم کے لیے بچھایا ہوا ہے۔

جرمن فلسفی کانٹ (Immanuel Kant) کہتا ہے:

''انسان اپنی زندگی دو قسم کے محرکات کے تحت گزارتا ہے۔ ایک حسّی (sensual) اور دوسرا اخلاقی (moral) اور دونوں محرکات کے مابین ایک معنوی ربط و تعلق قائم رہتا ہے۔ حسّی محرکات کا اخلاقی محرکات کے تابع ہونا ناگزیر ہے' اگرچہ عام طور سے ایسا ہوتا نہیں ہے' اخلاقی محرکات حسّی محرکات کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اور جونہی حسّی محرکات اخلاقی محرکات میں مزاحم ہوتے ہیں' یہ ''شر'' بن جاتے ہیں۔ اس لیے انسان میں فطری طور پر ''شر'' کا رجحان پایا جاتا ہے۔'' (بحوالہ: اسلام اور فلسفہ از خان محمد چاولہ)

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں خیر و شر کے فلسفے کو اسلام کے نقطہ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے۔ خالق ارض و سماء نے ہر انسان میں اپنی حکمت و مصلحت اور تکوینی اسرار کے تحت خیر و شر کے داعیات رکھے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ (الشمس)

''اور (قسم ہے) انسانی جان کی اور اس کی جس نے اسے سنوارا' پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری ہے اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیزگاری ہے۔ فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے' اور نامراد وہ ہوگا جو اس کو (گناہ میں) دھنسا دے۔''

قرآنِ حکیم کی آیات پر غور کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ خیر اور بھلائی کو کئی

معنوں میں بیان کرتا ہے۔ دراصل ہمیں اس عالمِ رنگ و بو میں جو شر نظر آتا ہے اس میں بھی کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے' یہ اور بات ہے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے بصیرت نہیں بصارت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل سورۃ البقرہ میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶﴾

''یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز کو تم برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو' حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

الشیخ ابن العربیؒ نے اپنی تصنیف ''فُصُوصُ الحِکَم'' میں لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کی چشمِ بصیرت ایسی نہیں کھولی کہ اشیاء کی فطرت اور ان کی حالت نفس الامری کو جانتا ہو' کیونکہ بعض اقتضائے عین سے عالم ہیں اور بعض جاہل' اسی لیے نہ سب کی ہدایت چاہی' نہ سب کی ہدایت کی اور نہ سب کی ہدایت چاہے گا۔''

رب العزت کے ہر کام میں خیر پنہاں ہوتا ہے۔ الوجود خیر کلہ کہ تمام وجود اپنی ذات میں خیر ہی خیر ہیں۔ برسات اگر کوٹھی بنگلوں اور مضبوط مکانوں کے مکینوں کے لیے بارانِ رحمت اور تفریح طبع کا باعث ہوتی ہے تو کچے پکے مکانوں اور جھگیوں میں رہنے والوں کے لیے یہی بارش زحمت' تکلیف اور پریشانیوں کا ذریعہ بنتی ہے۔ مگر بظاہر یہی تکلیف دہ چیز زمین میں بوئے گئے بیجوں کی آبیاری کے لیے' سوکھی اور پیاسی زمینوں پر لہلہاتی کھیتیوں' غلہ' پھل اور میوہ جات جیسی نعمت خداوندی کے حصول کے لیے قدرت کی بے پایاں نعمت ہے۔ علاوہ ازیں یہی برسات فضا میں پھیلی کثافتوں کو اپنے شفاف پانی سے دھونے اور بہت سارے جسمانی عوارض سے شفایابی کا باعث بھی بنتی ہے۔ گویا بظاہر نظر آنے والا شر انسانوں کے لیے خیر' بھلائی اور خوشحالی کی نوید لے کر آتا ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ خیر ہو یا شر دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی خیر ہیں اور اس پر ایمان لانا ایک مؤمن کے لیے لازمی ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا:

''بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے' اس کے ہر معاملے اور ہر حال میں خیر ہی خیر ہے۔ اگر اس کو خوشی اور راحت و آرام ملے تو وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کرتا ہے' اور یہ اس کے

لیے خیر ہی خیر ہے' اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ (اس کو بھی اپنے حکیم و کریم رب کا فیصلہ اور اس کی مشیت تسلیم کرتے ہوئے) اس پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر اور موجب برکت ہے۔'' (مسلم)

بندۂ مؤمن کا ایمان و یقین اس بات پر ہونا چاہیے کہ یہ دنیا اور اس کی اپنی زندگی ابدی اور غیر فانی نہیں ہے۔ اس لیے یہاں کی خیر و بھلائی' عیش و آرام' دنیاوی نعمتوں کو ایک دن ختم ہو جانا ہے۔ اور شر کا وجود اور اس کا پھیلاؤ بھی عارضی ہے' یہاں کی تکلیفیں' اذیتیں' ناانصافیاں اور ظلم و ستم بھی ایک دن فنا ہونے والا ہے' اور ان تمام کلفتوں' محرومیوں اور تلخیوں کا بہترین بدل آخرت میں ملنا یقینی ہے۔

جس کو ان حقائق پر تیقن حاصل ہو گیا اس کے لیے اس دنیا میں نہ کوئی غم باقی رہے گا اور نہ کوئی خوف! دراصل آزمائش کی اساس ہی خیر و شر ہے۔ آزمائش مقصود نہ ہوتی تو نہ شر ہوتا اور نہ خیر کا کوئی تصور' اور نہ موت و زندگی کا یہ سلسلہ تخلیق کیا جاتا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲﴾ (الملک)

''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا ہے تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''مؤمن مطالبے نہیں کرتا' نہ غصہ جھاڑتا ہے اور نہ ہاتھا پائی کرتا ہے'' —— خیر ہو یا شر دونوں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہیں' چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کا کام اللہ کی رِضا اور اس کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کر دینا ہی بندگی کی شان ہے۔ شر کے پردے میں حکمت الٰہی کو سمجھنے کی جُہد مسلسل انجام کار ایک دن ذہن کے پرت کھول کر حقیقت سے پردہ اٹھا ہی دیتی ہے اور انسان حین حیات اس گردابِ تردد اور ورطۂ حیرت سے باہر نکل آتا ہے۔ ؎

تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نہ یابی!

❁❁❁

اقبال کے نظریۂ خودی کی قرآنی تعبیر

پروفیسر عبداللہ شاہین☆

اقبال کا ''نظریۂ خودی'' جس کا بہت شہرہ ہے' اس کی مختلف بلکہ متضاد تشریحوں اور تعبیروں کے باعث معاملہ بالکل وہی ہو چکا ہے کہ: ع

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا!

یعنی میں اپنے ''خواب'' کی متعدد تعبیروں اور تشریحات کے باعث پریشان ہو گیا ہوں۔ مگر ''خودی'' کی بہترین تعبیر و تشریح وہی ہے جسے شاعرِ مشرق نے بیان فرمایا ہے اور جس کے راوی سید نذیر نیازی کا کہنا ہے کہ:

''میں نے علامہ اقبال سے ان کے فلسفۂ خودی کا ماخذ جاننا چاہا۔ انہوں نے فرمایا: ''کل آنا'' میں اگلے دن کاپی پنسل لے کر بڑے ذوق و شوق سے کشاں کشاں ان کے درِ دولت پر پہنچا۔ آپ نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور فرمانے لگے: ''میں تمہیں اپنے نظریۂ خودی کا ماخذ بتاتا ہوں''۔ میرا خیال تھا کہ ابھی آپ فلسفہ (philosophy) کی کچھ ضخیم کتابیں اٹھا کر لائیں گے اور نشاندہی فرمائیں گے۔ مگر کہنے لگے: الماری سے قرآن حکیم اٹھا لاؤ! میرے (اشتیاق و تجسّس کے) جذبات پر اوس پڑ گئی۔ پھر علامہ نے ''سورۃ الحشر'' کی یہ آیت نکالی: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۹) (اور تم ان لوگوں جیسے نہ ہونا' جنہوں نے اللہ کی ہستی کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان (غافلین) کو ان کی اپنی (انسانی) ہستی (کی عظمت) کے شعور سے بے بہرہ کر دیا) پھر فرمانے لگے: ''میں نے اپنا فلسفۂ خودی اس آیۂ مبارکہ سے اخذ کیا ہے۔''

گویا ''نظریۂ خودی'' خدا پرستی اور نتیجتاً خود شناسی کا نام ہے۔ اور آگے چل کر اسی کا

☆ ریٹائرڈ پرنسپل' گورنمنٹ کالج حافظ آباد

تفصیلی بیان ہوگا۔ لیکن تمہیداً جانیے کہ خودی ـــــ تعلّی' تفاخر اور تکبّر جیسی صفات کا دوسرا نام نہیں ہے' کیونکہ ''خودی'' سے خود پسندی' عجب' انانیت' استکبار' نخوت' تمکنت' غرور اور گھمنڈ کا کیا تعلق؟ یہ تو سادہ الفاظ میں ''خودداری اور وقار'' کا نام ہے ـــــ نیز یہ کہ انگریزی لفظ ''ego'' ـــــ عربی لفظ ''اَنَا'' اور اردو لفظ 'مَیں'' بھی ''خودی'' نہیں' کیونکہ ''مَیں'' (Iam) تو ''اکڑ'' پیدا کرتی ہے جبکہ ''خودی'' (self) ''عزتِ نفس'' کا نام ہے۔ بقول اقبال ع ''اپنی خودی پہچان' او غافل افغان!''

مگر مقامِ حیرت و افسوس ہے کہ صوفیانہ نظریہ کے قائل حضرات نے خودی کے فلسفہ کو ''وحدت الوجود'' کی نئی تعبیر قرار دیا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک ہر شے سے قبل' تخلیقِ اشیاء سے قبل' بلکہ خدا کے علمِ تخلیق سے قبل' قادرِ مطلق خود اپنی وحدت میں' اپنی ذات ہی سے ہمکلام تھا ـــــ خدا کی اس خالص خودستائی کا نام ''عشق'' ہے ـــــ اپنی مکمل خلوت میں خدا ''عشقِ اَنا'' میں مبتلا اور عشق کے ذریعے سے ''خودستائی'' اور 'خودنمائی'' میں مصروف تھا۔ تب خدا نے اپنے عین (خود) سے خواہش کی کہ اپنی انتہائی مسرت کا اظہار کرے[1] ـــــ تاکہ اس کا ادراک کر سکے اور اس سے ہمکلام ہو سکے ـــــ اُس نے اپنی ابدیت (Eternity) میں جھانکا اور ''لاوجود'' سے ایک ایسا عکس پیدا کیا' یعنی اپنا عکس' جس میں اس کی ذاتی صفات و اسماء موجود تھے۔ اور یوں آدم کی تخلیق ہوئی۔ نگاہِ یزدانی نے اس صورت کو اپنی شبیہہ میں ہمیشہ کے لیے ڈھال دیا۔ (آر۔اے نکلسن بحوالہ ''کتاب الطّواسین'' از منصور حلاج)

مؤلف آر اے نکلسن مزید لکھتا ہے کہ:

''.....قدیم یہودی اور عیسائی روایت سے کہ ''خدا نے انسان کو اسی کی شبیہہ میں بنایا (God created man in his own image) سے صوفی حلّاج نے تخلیق

(۱) متصوفین نے بھی ایک ''حدیث قدسی'' گھڑی ہوئی ہے: ''كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ'' یعنی ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا' میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو مخلوق بنائی۔''

☆ صحیح حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ)) (متفق علیہ) جن کا معنی یہ ہے کہ ''اللہ نے آدمؑ کو اُس کی منفرد صورت پر پیدا کیا''۔ یہ نہیں کہ اللہ نے اپنی صورت پر آدمؑ کو پیدا کر دیا۔

(آدم) کا یہ انوکھا نظریہ وضع کیا۔ اگرچہ یہ اندازِ فکر ہر لحاظ سے ایک اختراعی (یعنی من گھڑت) مکتب فکر (School of Thought) ہے' لیکن اس پر ایک صوفیانہ ''الٰہیاتی دبستان'' کی پوری عمارت کھڑی ہے جس میں آدمؑ کو ''شبیہ ربانی'' قرار دیا گیا ہے۔''

اور اسی نظریہ کی بنیاد پر منصور حلاّج نے ''اَنَا الْحَقُّ'' (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگایا تھا۔ بعض حضرات کے تحفّظات (reservations) اور اشکال ہیں کہ اقبال کا فلسفہ خودی' جس کا بڑا شہرہ وغوغا ہے' کہیں ''اَنَا الْحَقّ'' کی عصری توجیہہ وتعبیر تو نہیں؟ کیونکہ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں اقبال نے اپنی کتاب ''جاوید نامہ'' کے فلک مشتری میں ابنِ حلاّج کے خیالات کو بڑا موزوں شعری جامہ پہنایا ہے۔ چنانچہ ان اشعار پر بعض معاصرین نے ''انتقاد'' بھی لکھے' جس کی ایک مثال حافظ محمد اسلم جیراج پوری کی کتاب ''نوادرات'' میں (اقبال کے مجموعہ کلام) ''جاوید نامہ'' پر تبصرہ ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رائے میں مسلمانوں کے تصوف پر زیادہ تر وحدت الوجود کا مسئلہ چھایا ہوا ہے۔ اقبال کے مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' میں کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے' مثلاً:

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے' غنچہ میں وہ چٹک ہے

(نیز یہ کہ) —— ''وحدتِ وجود'' کا اعلان کرنے والے ''منصور'' کو اقبال نے آخر تک گمراہ خیال نہیں کیا بلکہ اس کے ''انا الحق'' سے اپنے ''نظریۂ خودی'' کو استوار کیا۔ بقول اقبال ؎

فردوس میں رومیؔ سے یہ کہتا تھا سنائیؔ
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ' وہی آش!
حلاّج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اِک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش!

البتہ عبدالسلام ندوی کی رائے ہے کہ:

''ڈاکٹر (اقبال) صاحب کے کلام میں اگرچہ ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات بکثرت موجود ہیں' لیکن ان کے نام اور کلام کو جس چیز سے شہرتِ ابدی حاصل ہوئی ہے' وہ ان کا فلسفۂ خودی ہے۔ مگر خودی سے فخر وغرور مراد نہیں بلکہ اس سے استقلالِ ذاتی مراد ہے۔''

قصہ مختصر اگرچہ ہمارے صوفیاء انسان کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں' لیکن ان کے نزدیک ''نفس انسانی'' اس فضیلت کا سبب نہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ''خدا کا پرتو'' ہے —— لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک انسان کو جو شرف حاصل ہوا ہے وہ محض ''انسانیت'' کی وجہ سے ہے۔ پیش نظر رہے کہ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴﴾ (التین) اور ﴿وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۰) —— البتہ قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے عظیم ترین ہونے کو بھول جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں خود تمہارے شرفِ انسانی سے غافل کر دے گا۔ (سورۃ الحشر) نیز سورۃ الحج میں ایسے ''خدا فراموش'' انسانوں کے بارے میں فرمایا: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳﴾ (الحج) ''طالب ومطلوب دونوں ہی گئے گزرے ہیں۔''

اس کے برعکس ''خداشناس'' لوگ جب عظیم ترین ہستی اللہ جل شانہ کو اپنا مطلوب بنالیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو شرفِ انسانی اور اس کا شعور عطا فرمادے گا۔ اس کی سادہ مثال یہ ہے کہ جب شہد کی مکھی (bee) نے اپنا مطلوب حسین اور خوشبودار پھولوں کو بنایا تو اللہ نے اسے یہ ''شرفِ نفس'' دیا کہ اس کے پیٹ سے نکلا ہوا لعابِ دہن شہد کہلایا اور اس نے انسانوں کی غذا اور شفا کا درجہ پایا' جبکہ گندگی اور فضلہ کی طالب مکھی (fly) کا جھوٹا اور چھوا ہوا غلیظ اور بیماری کا سبب قرار پایا۔

الغرض اگر ''خودی'' کا تصور سورۃ الحشر کی آیت مبارکہ: ﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ ؕ﴾ سے ماخوذ ومستنبط ہے' تو خوشا ومرحبا! اور اقبال کا بھی یہی دعویٰ ہے۔ بجز اس کے کہ اقبال نے ترتیب معکوس کر دی ہے۔ قرآن کا تو بیان ہے کہ معبودِ حقیقی' اللہ تعالیٰ کے اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْم ہونے کا عرفان حاصل کرو گے' یعنی اس کو عظیم ترین مانو گے تو ربّ تعالیٰ تمہیں ''اشرف المخلوقات'' ہونے کا شعور عطا فرمادے گا۔ لیکن اقبال کہتا ہے کہ اپنی خودی کی پہچان سے اللہ کی پہچان ہوگی۔ بقولہ: ع ''نمود تیری' نمود اُس کی''☆..... یعنی معرفتِ الٰہی بغیر معرفت نفس کے ممکن نہیں ..... خودی سے خدا بے حجاب ہوتا ہے (.....ہم زخودی خدا طلب)۔ شاید اقبال نے یہ تأثر عربی کے ایک معکوس الترتیب مقولہ سے لیا ہو کہ: مَنْ عَرَفَ

☆ بحوالہ ''روحِ اقبال'' از ڈاکٹر یوسف حسین خان

نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ''جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''—لیکن اقبال کا یہ کہنا بجا ہے کہ:

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے

یعنی خودی کی نمود' اللہ کی پہچان سے ہوتی ہے۔ خودی کا تو اصول ہی یہ ہے کہ خودی کی تلوار تیز ہی ''لا الٰہ اِلا اللہ'' کی سان پر ہوتی ہے ؎

خودی کا سِرِّ نہاں' لا الٰہ الّا اللہ
خودی ہے تیغ' فساں لا الٰہ الّا اللہ!

خودی تو اللہ ذوالجلال والاکرام کے حضور ''انکسار'' اور غیر اللہ کے مقابل ''وقار'' کا نام ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگر اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہوتے اور ان کے ہاتھ سے کوڑا یا چھڑی گر جاتی تو کسی سے پکڑانے کی استدعا نہ کرتے' بلکہ سواری سے اتر کر خود پکڑتے' کیونکہ غیر اللہ سے سوال کے باعث خودی مجروح ہوتی ہے۔ لہٰذا بقولِ شاعر: ؎

ہر چیز مُسبّب سبب سے مانگو
منّت سے' خوشامد سے' ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے' تو رب سے مانگو!

کیونکہ: ع ''خودی کی خلوتوں میں کبریائی'' یعنی جب تم گوشۂ تنہائی میں ''اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ'' کہہ کر یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ پر غور کرو گے تو ع ''خودی کی جلوتوں میں مصطفائی''.....مجلسی زندگی میں تمہارے اندر سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کے خواص پیدا ہو جائیں گے اور پھر تمہاری شان یہ ہو جائے گی کہ ع ''سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے'' بشرطیکہ ع ''تعمیرِ خودی کر' اثرِ آہِ رسا دیکھ!'' چنانچہ: ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

پس ع

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر!

ازاں بعد علامہ اقبال مسلمان سے تاسف اور استعجاب سے سوال کرتے ہیں:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اگر تمہارے اندر یہ خوبی پیدا ہو جائے تو ضرور بالضرور ہے کہ:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

نتیجہ یہ کہ ع

مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کیونکہ اس کا بھروسہ کُلّی طور پر اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ یہ تو کافر کی پہچان ہے کہ ع

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ

لہٰذا مسلمان کا توکّل کُل کا کُل اللہ کی ہستی پر ہوتا ہے۔ وہ غیر اللہ سے استغناء کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے اور ایک اللہ کی ہستی کے مابین کسی واسطہ یا وسیلہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کے بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ پس اقبال نے اسے تلقین کی ہے کہ ع

خودی نہ بیچ' فقیری میں نام پیدا کر!

ایک مؤمن ''فقر و غنا'' کا مجسمہ ہوتا ہے۔ اسی لیے تو اقبال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ وہ اُمّتِ محمدیہ کو یہ مقام عطا فرمائے:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں — غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن — کسی جمشید کا ساغر نہیں میں!

آمین!

❁❁❁

Nov 2018
Vol.67

Regd. CPL No.115
No.11

Monthly **Meesaq** Lahore

سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرتِ طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- صفحات: 240
- قیمت: 180 روپے

خود مطالعہ کیجیے
دوستوں کو تحفہ پیش کیجیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501 (042)
فیکس: 35834000 (042) ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org